NATIONAL PRESS URDU LITERATURE SERIES No. 23.

دیوان حالی

یعنی

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

کے

تمام منظوم کلام کا مکمل مجموعہ

ناشر

لالہ رام نرائن لعل بکسیلر

الہ آباد

۱۹۴۰ء

قیمت فی جلد عمر
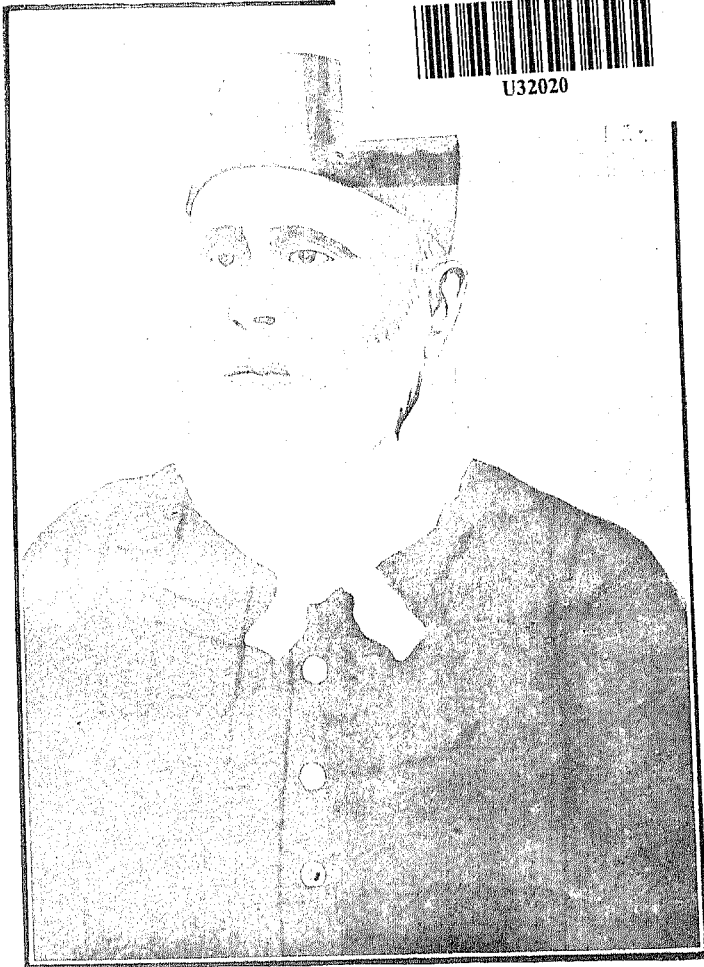
مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

شمس العلما خواجہ الطاف حسین پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پانی پت میں سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ چلی آتی ہے۔ آپ اسی قوم کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ نو برس کی عمر میں آپ کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال ہو گیا۔ سایۂ پدری اُٹھ جانے کے بعد آپ کی تعلیم و تربیت کا بار آپ کے بھائی بہن پر پڑا۔ دستور کے مطابق پہلے آپ نے قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر میر ممنون دہلوی کے بھانجے سید جعفر علی سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھنا شروع کی۔ ابھی تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ آپ کی مرضی کے خلاف شادی کردی گئی۔ اُس وقت آپ کی عمر سترہ سال کی بھی نہ ہونے پائی تھی۔ شادی کے بعد سب کی یہ خواہش ہوئی کہ آپ کوئی ملازمت اختیار کرلینا چاہیئے۔ لیکن تحصیل علم کے شوق میں آپ گھر والوں سے روپوش ہو کر ۱۸۵۴ء میں دہلی چلے گئے۔ وہاں مولوی نوازش علی سے ڈیڑھ سال عربی پڑھی۔ اُس وقت آپ کو صرف و نحو، منطق، عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۵ء میں اپنے عزیزوں کے اصرار سے آپ کو پھر پانی پت آنا پڑا۔ یہاں بطور خود کتب بینی کا مشغلہ جاری رکھا۔

اسی زمانہ میں آپ کی رسائی مرزا غالب تک ہوگئی اور اُن کی صحبت و ہمت افزائی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔

۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں آپ ملازم ہو گئے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر کی وجہ سے آپ کو پھر اپنے وطن واپس آنا پڑا۔ وہاں چار برس کے قیام میں آپ نے اکتساب علم کا سلسلہ جاری رکھا اور منطق و فلسفہ کے ساتھ حدیث و تفسیر کا

مطالعہ کیا۔

۱۸۶۳ء میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے جو جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات ہو گئی اور آپ آٹھ برس تک اُن کے مصاحب رہے شیفتہ نہایت عالم فاضل اور مشہور شاعر تھے۔ حالی کا شاعری کا شوق شیفتہ کی صحبت سے چمک اُٹھا اور اب اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجنے لگے۔

نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد آپ لاہور چلے گئے۔ وہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں آپ کو ایک جگہ مل گئی۔ وہاں جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت درست کرنے کا کام آپ کے ذمّہ تھا۔ تقریباً چار سال آپ یہ کام کرتے رہے۔ اِس سے انگریزی لٹریچر میں آپ کو کافی دستگاہ حاصل ہو گئی۔ اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے آپ کو خاصی مناسبت پیدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ مشرقی شاعری اور مشرقی انشا پردازی خصوصاً عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہوتی گئی جس زمانہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں ایک نئے طرز کے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی اُسی زمانہ میں حالی نے چار مثنویاں برکھا رُت، اُمید، رحم و انصاف اور حبِّ وطن پر لکھیں اور اُس مشاعرہ میں پڑھیں۔

چار برس بعد آپ لاہور سے دلّی آئے۔ اور اینگلو عربک اسکول میں مدرّس مقرّر ہو گئے۔ اُسی زمانہ میں آپ کی ملاقات سرسیّد سے ہوئی۔ اُن ہی کی فرمائش سے آپ نے مشہور و معروف مسدّس مدّ و جزرِ اسلام، تصنیف کیا۔ ۱۸۹۶ء میں آسمان جاہ مدار المہام حیدر آباد علی گڑھ آئے۔ سرسیّد نے اُن سے آپ کا تعارف کرایا۔ نواب صاحب نے ازراہِ قدردانی ۷۵ روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرّر کر دیا۔ اس کے بعد جب آپ علی گڑھ کالج کا ایک وفد لے کر حیدر آباد گئے تو وہاں آپ کا وظیفہ ۷۵ روپے سے سو روپئے ماہوار ہو گیا۔ حیدر آباد سے وظیفہ

مقرر ہونے کے بعد آپ نے ملازمت ترک کر دی اور پانی پت میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جہاں آپ ادبی خدمات انجام دیتے رہے ۱۹۰۴ء میں ادبی خدمات اور علم و فضل کے صلہ میں آپ کو "شمس العلما" کا خطاب ملا۔ بالآخر ۷۷ سال کی عمر میں ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

مولانا الطاف حسین حالی نے جو پُرکیف روح ہماری شاعری کے مُردہ اور بے جان جسم میں پھونکی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مولانا نے ہماری شاعری کو فحش، ناپاک، خرافات اور گندے و عامیانہ خیالات سے بالکل پاک کر دیا اور اُسے پند و موعظت۔ اخلاق اور اصلاح معاشرت، ادب اور فلسفہ کے سانچے میں اس خوبی سے ڈھالا کہ آج ہم نہایت فخر کے ساتھ تمام دنیا کے لٹریچر کے مقابلہ میں اپنی زبان کے کلام کو پیش کر سکتے ہیں۔ اور کہیں نا رہئے کہ اخلاقی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ مذہبی اور پند و نصائح کی نظموں کا بیش بہا ذخیرہ اُردو ادب میں موجود ہے۔ آپ کا کلام چھچھورے۔ بازاری اور مبالغہ آمیز الفاظ و محاورات سے بالکل پاک ہے نہ اس میں معشوق کی بیوفائیوں کے دُکھڑے ہیں نہ ہجر و وصال کے جھگڑے، نہ گل و بلبل کے تذکرے ہیں، نہ عشق و عاشقی کی داستانیں۔ نہ واعظوں پر پھبتیاں ہیں، نہ ناصحوں پر چھلوائیں، اِن تمام خرافات اور نجس و پلید خیالات سے ہماری شاعری کو پاک و مطہر کر کے مولانا نے اُسے جس معراج ترقی پر پہنچایا وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام اس قدر مقبول خاص و عام ہوا کہ نہ صرف ہندوستان کے بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے بلکہ سمندر پار فرانس اور انگلستان، افغانستان و ایران تک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی شہرت ہے، ہندوستان کی متعدد زبانوں میں آپ کی نظموں کے ترجمے ہوئے اور ہندی میں تو یہ کام بہت پہلے ہو چکا ہے۔ آپ کی مشہور و معروف نظم "بیوہ کی مناجات" کے اب تک دس زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ آپ کی

مسدس "مد و جزر اسلام" نے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہلکہ مچا دیا۔ اس مسدس کے اشعار ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ بہتوں نے تو اس کو وردِ زبان کر لیا۔ غرض آپ کا کلام حال و قال کی محفلوں میں، قومی جلسوں میں اور سیاسی مجمعوں میں سنا اور پڑھا جاتا ہے۔ مذہبی تصنیفوں میں وہ نقل کیا جاتا ہے اور طلباء کے نصاب میں داخل کیا جاتا ہے۔

حالی مرحوم نے اپنا اُردو شاعری کا دیوان آخری وقت میں شائع کیا اور اپنی شاعری پر سوا دو سو صفحات کا مبسوط مقدمہ اس کے ساتھ شامل کیا جو دیکھنے کے قابل ہے۔ اس کے پڑھنے سے مولانا کے مذاق شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

غرض مولانا حالی دورِ جدید کے اُن مشہور لوگوں میں تھے، جنھوں نے پرانے مدرسوں میں تعلیم پا کر ایسے کارنمایاں کیے جن کی مثال تعلیم جدید اب تک نہیں پیدا کر سکی۔

مولانا کا فارسی و عربی کلام اُن کی حیات میں ہی مرتب ہو چکا تھا۔ اُردو کلام کی تدوین کرنے ہی کو تھے کہ پیام اجل آ پہنچا اور وہ اس کام کو خود نہ انجام دے سکے۔ مولانا کے انتقال کے بعد ایک مدت تک اُن کی نظمیں متفرق طور سے چھپ چھپ کر شائع ہوتی رہیں۔ لیکن مجموعہ کی شکل میں کسی کو چھاپنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ چند مطابع میں شائع بھی ہوا تو وہ بھی مکمل طور سے نہیں۔ ہم نے نہایت محنت و کاوش سے مولانا کے کل کلام کو جمع و فراہم کرنا شروع کیا۔ شکر ہے کہ اس کام کا تکملہ ہو گیا۔ اس دیوان کے ہر شعر کی تصحیح پوری تحقیق و تدقیق سے کی گئی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی فروگذاشت ہو گئی ہو تو ہمیں معاف فرمایا جائے۔

ناشر

فہرست عنوان

قطعات

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خُطوط اِک دانا نے — کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو اِن میں جتنے ہیں خط — کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی؛ جو بے ہاتھ لگائے — دے یونہیں چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے جتنے خط تھے بڑے — اُٹھ کے دیا ایک اِک کو مِٹا
جب نہ رہا واں پیشِ نظر — خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اُٹھا کر آنکھ جدھر — تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہے یارو بات کہ تھی — قوم میں باقی جان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اَب — آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں — اخطل و اعشیٰ کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت — جن پہ کہ نازاں تھی انشا
شعر میں تھے اُستاد اکثر — سحر بیاں اور نکتہ سرا
لے گئی اِن کو آخر کار — بحرِ فنا کی موج بہا

اہلِ ہنر کا نام و نشاں قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زیدؔ و عمرؔ بنے صاحبِ دیوان نامِ خدا
اب چاہو استاد گنو یا ہمیں سمجھو تم یکتا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر
کَبَّرنَا مَوتُ الکُبَرا

شعر کی طرف خطاب

اے شعر دلفریب نہ ہو تو - تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے - جو نہ ہو دلگداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو
آپ اپنے کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کرکے رہیگا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو

اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ
معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر عَلَمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے راہ
گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

عزّت کا بھید مُلک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو بے بحل — بڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بیقدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے کر اُس پہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف — طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی، جو عشق کا کرتے تھے بیاں — جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ اُلفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ — سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر — نہ رہی چیز وہ مضمون سوجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف — گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں — لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر — کیجئے درد جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائیے جوانوں کے دل آتش کی طرح — وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں — جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعی بلیغ — اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنے کے نظم و نثر میں دریا بہا — اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں — شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

بے تمیزی ابنائے زماں

از رہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا — ہے وجود اے تبذل تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ — تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا — امتحاں کے وقت کھلجاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا — گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز — ہیں مبصّر ایسے اس بازار نا پرساں میں کم

تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑ رہتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک

کہتے ہیں ایک امیر زادہ کو — تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں

خصلتیں جو امیرزادوں میں — لازمی ہیں۔ وہ اُس میں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہُنر کوئی — اس پہ تھا خود پسند اور خود بیں
کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ — علم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سُنتے سُنتے یاروں کی — ہو گیا تھا ہُنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں — جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشق تیر افگنی میں تھا مصروف — کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اِک ظریف نے حال — وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کمان سے چھوٹے — پائے سب بے اُصول و بے آئیں
جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا — تیر آماجگہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھٹ کے سوئے شمال — ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی — رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تودے پہ جا کے ہو بیٹھا — لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چِلّا کر — کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے — یا کہ دو بھر ہے تجھ کو جان حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا — جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے اِن بے پناہ تیروں کی — کہیں جاں دار کو امان نہیں

مُجھ کو ہر پھیر کے شش جہت میں حضور
امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

پولیٹکل اسپیچیں

اَے بزمِ سفیرانِ دُوَل کے سخن آرا — ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن — کچھ سحر بیانی کا ترے ڈھنگ نیا ہے
ظاہر ہے نہ غصّہ ہے بیاں سے تری رنجش — لے لطف میں کچھ طرزِ بیاں اس سے جدا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار — اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صُلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں — اور جنگ میں کچھ لُطفِ سخن اس سے سوا ہے
گر سوچئے تو سیکڑوں پہلو ہیں سفر کے — اور سُنئے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات — گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانئے کیا ہے
کھُلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے — اِک مُرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب پئے اظہار یہ اب آ کے کھُلا یہ
انسان کو اخفا کے لئے نطق ملا ہے

بدی کر کے نیکنامی کی توقّع رکھنی

نا منصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم
برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیّت
جب دَورہ کو اُٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر
تھا پوچھتا ایک ایک سے ازراہِ شرارت

ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا
کرتے ہیں ہماری وہ ستائش کہ مذمت
تھی اس کی مثال ایسی کہ اک شخص بد آواز
جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے
ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سرعت
ہو۔ تاکہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری
آواز خوش آیند و یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا زینت و اسباب پہ جو لوگ اِتراتے ہیں اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"
حالی نے کہا جن کو ہے اِترانے سے نفرت اِترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے

سیّد احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں بعض کے نزدیک توحید اس کی حدِ تام ہے
ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول جو ہیں قائل اس کے اُن پر کُفر کا الزام ہے
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اُس رحمت کو عام جس سے غیر از اہلِ قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ شر ہے تیرے سب ایمن رہیں بس مسلمانی و دینداری اِسی کا نام ہے

پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عند الفحول — کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اُسے وہ خام ہے

ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ — اور سب کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے

بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس — جو لباسِ غیر پہنے خارج از اسلام ہے

بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ — حصر کرنا اِن تمام آرا کو مشکل کام ہے

مذہب[۱] منصور ہے لیکن بیاں کرنا ضرور — جو مسلّم آج کل نزدیک خاص و عام ہے

اہلِ حلّ و عقد ہیں اب متّفق اس رائے پر

سیّد احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

قرض لے کر حج کو جانے کی ضرورت

قریبِ موسمِ حج۔ قرض لے کے اِک دیندار — چلا بہ نیّتِ حج۔ گھر سے سوئے بیت اللہ

کہا یہ اُس سے اِک آزاد نے کہ اے حضرت — کیا ہے آپ کو شارع نے جبر یا اکراہ

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز — وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ

نہ نان و نفقۂ فرزند و زن سے خاطر جمع — نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ

سُنا یہ۔ اور بہت تُرش ہو کے فرمایا — کہ رُوکتا ہے مسلماں کو حج سے اَے گمراہ

وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے — نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی؟ — پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے برّ و بحر کی راہ

جنھیں فراغت و تنگی میں ہے اُسی سے اُمید — جنھیں سلامت و آفت میں ہے اُسی کی پناہ

---

[۱] اقوال مختلف میں سے جو قول راجح ہو اُس کو "مذہب منصور" کہتے ہیں ۔ ۱۲

وہ سن کے بولا کہ "ناخواندہ مہمانوں کو — اُمید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ
ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں — طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ
یہ سن کے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر کہ کہیں — ہو مدعی نہ تجسس میں یاں کوئی ہمراہ
بُلا کے پاس پھر آہستہ اُس سے فرمایا — "ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ
قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے — جوان خام کی واں تک نہیں پہنچتی نگاہ
خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر — فتوح جن میں ہے دُنیا و دیں کی خاطر خواہ
نماز و روزہ ہو۔ یا ہو طواف و عمرہ و حج — حصول جیسے کہ ہوتا ہے اُن سے قرب الٰہ
اُسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام — نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوشش جانکاہ
مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے۔ ورنہ — ہزاروں پھرتے ہیں محتاج سادہ لوح تباہ

یہ کہنے سُننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک ہشاری نے کہا "حاصل ہے آزادی جنہیں
قدر داں اُن سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اُتنی ہے کم

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بینوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
"تعرف الاشیاء بالاضداد"[1] ہے قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
ہے[2] سفر موری کے کیڑے کے لئے باغِ ارم"

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں "آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر- کرامت ہے یہ انگلستاں کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جونہیں رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی
قلبِ ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد- یاں- آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

---

[1] یعنی ہر ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے - ۱۲ [2] یعنی جس طرح موری کے کیڑے کو موری میں آرام ملتا ہے اور وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا - اسی طرح جو قومیں ہمیشہ محکوم رہتی چلی آتی ہیں وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں - ۱۲

۱۱

سیّد احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سیّد احمد خاں کے اِک مُنکر سے یہ پوچھا کہ "آپ"
کس لئے سیّد سے صاف اے حضرتِ والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اُس کو ٹھہراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اُس کا نزدیک آپ کے گویا نہیں
آپ بھی (نامِ خدا) ہیں تارکِ صوم و صلوٰہ
اور سلوکِ اسلام سے خود آپ کا اچّھا نہیں
خود نبوت پر سُنے ہیں ہم نے ایراد آپ کے
اور اُلوہیّت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں
چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سیّد پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں

سُن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے سُن لو صاحب تُم سے کچھ پردہ نہیں
رنج کچھ اِس کا نہیں مجُھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اِس کی کہ میں ویسا نہیں

قحط اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری　　جو تھا سو چشم پُرنم اپنا تھا یا پرایا
"دُنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق　　یہ کہہ کے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا "مُریدی باقی رہی نہ پیری"　　یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اُس کو بھی رُلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگزر تھی اور نہ ساتھ اُن کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف
کام سے مُہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو در کنار
ذکر کیا نکلے جو کچھ اُس کے منہ سے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اُس سے دوچار
نتھنے پھولے، مُنہ چڑھا، ماتھے پہ بل، ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لئے کوئی فتوح
آکے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
ہوتا تھا اِک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس

فرض جس میں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں
حکم ہوتا تھا "شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں"
تاکہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں
واں سوا تنخواہ کے۔ تھا جس کا آقا ذمہ دار
تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمّہ تھیں
دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں

ایک دن آقا تھا اِک مُنہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
اور گرا اسوار صدرِ زیں سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش نہ چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب۔ کہ ہو آکر معیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں

دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
"دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں"

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
اِسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم
زباں جس کی ہو ایک از نسل و مذہب
مگر وسعت اُسے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو رائے میں اپنے مذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اِس کی نہ ہو مفہوم اُس کو
ہوں آدم تک جُدا سب کے جَدّ و اَب
جو واحد لاشریک اُس کا خدا ہو
تو لاکھوں اُس کے ہوں معبود اور رب

صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گذرا کہیں میلا کچیلا اِک غلام
اُس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُس کو کی
عرض کی "ایک اک رواں ہو جس بدن کا مِلک غیر
اختیار اُس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی"

جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسم آدمی ہیں پیش اہلِ معرفت
کوئی چیز اُس کی نہیں سب ہے امانت گور کی

دلّی کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالی سے کہا از رہِ انصاف — کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اُس کے سخن کو
چند اہلِ زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا — بولے کہ "نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے — ہو چھو نہ گئی غیر زباں اُس کے دہن کو
معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشا — اُردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو
اُردو کے ٹھیٹ وہ ہیں جو دلّی کے ہیں روڑے — پنجاب کو مَس اس سے نہ پورب نہ دکن کو
بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے — کیا عالم گلشن کی خبر زاغ و زغن کو
حالی کی زباں گر بمثلِ شکر لبن ہو — خالص نہ ہو تو کیجئے کیا لے کے لبن کو
ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ — پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو
مانا کہ ہے بیساختہ پن اُس کے بیاں میں — کیا پھونکیے اِس ساختہ بیساختہ پن کو

یہ دوست نے حالی کے سنی جب کہ تعلّی — حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو
کچھ شعر تھے یاد اُن کے پڑھے اور یہ پوچھا — "کیوں صاحبو! عزّت اِسی اُردو سے ہے فن کو

سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے | کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسمِ عرب | کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اُسے گود سے لے کر ماں کی | گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر

رسم اب بھی یہی دُنیا میں ہے جاری لیکن | جو کہ اندھے ہیں ہے ہے کہ نہیں کچھ اُن کو خبر
لوگ بیٹی کے لئے ڈھونڈھتے ہیں جب پیوند | سب سے اوّل اُنھیں ہوتا ہے یہ منظور نظر
ایسے گھر بیاہئے بیٹی کو جو ہو آسودہ | اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانہ کے سارے زن و مرد | اُن کے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر
ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد | دونوں نزدیک قرابت میں ہوں باہمدیگر
جیتے جی مر گئی بس اُن کی طرف سے گویا | جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو | پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
بدمزاجی ہو۔ جہالت ہو۔ کہ ہو بدچلنی | کچھ بُرائی نہیں۔ ذُو نسبا[1] ہو داماد اگر
وہ یہی ناشدنی رِیت ہے جس کے کارن | بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

---

[1] یعنی ذات کا اصل اور شریف ۱۲

جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر

ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ در گور سدا رہتے ہیں او رخستہ جگر

اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

سیّد احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی

وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اُس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی

اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اُس کی نہ تقدیر سے چلی

روزی کی خاطر اُس نے کئے سیکڑوں جتن
پر کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری

راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اِک خضر پے خجستہ نے کی آکے رہبری

جُھک کر کہا یہ کان میں اُس کے کہ اَجبل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی

جا۔ اور لفظ لفظ کو اُس کے چھیڑ کر
تردید اُس کی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی

پھر دیکھنا کہ راس وچپ گرد و پیش سے
لگتی ہے کیسی آکے زر و سیم کی جھڑی

دُنیا طلب کو چاہیئے ابلہ فریب ہو
دُنیا پہ جب تلک کہ مسلّط ہے ابلہی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست ۔۔۔ دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وسوسے ۔۔۔ ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست ۔۔۔ جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر ۔۔۔ گو حاجت اُس کی آن سے ہوئی ہے نہ ہووا
آتا نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور ۔۔۔ اُمید اُس کی روز فزوں ہے اور التجا

تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجئے بھیک دوڑ کر۔ گُر ہے گداگری کا یہ ۔۔۔ جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے
ہے یہی اصل اکتساب ہو جئے سب سے مستفید ۔۔۔ زک ملے یا سزا ملے۔ درس ملے ادب ملے

لائق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجئے ۔۔۔ ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اوّل تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو ۔۔۔ اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر

پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب — سو سو طرح سے وہ اُسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست — منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال — رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اُس سے مستتر

گو قول ہے متین پہ جو تھی سخن کی تہہ — افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید — عیب اُن کے دوست کیوں نہ جتائینگے بے خطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب — وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور

جن کو خدا نے جوہرِ قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت[1] اُن کی نہ دشمن نہ دوست پر

سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز — پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اُس کو
موجود سخنگو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ — اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخنگو
دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ — پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا — "گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے"
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھ سے الگ — میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

---

[1] عبرت و اعتبار نصیحت حاصل کرنا۔ ۱۲

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبّر کی ہے رائے　　چاہیئے گر رونقِ علم زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجیے رُکن　　جن پہ اُس کی سب رُکاوٹیں ہیں عیاں"

رائے صائب ہے بظاہر اور متین　　گو کیا اِس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ　　ہے بہت کم برخلاف اِس کے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب　　شاعروں کے ہاتھ ہو اُس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے　　شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر اُن میں سے چل سکتا نہیں　　دوسرے کا جادوئے حُسنِ بیاں

ایک جب چلنے نہ دیگا ایک کی
پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں؟

لوگ کسی کی خوبیاں سُن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اُس کے عیب سُن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنون حالی　　اس قدر خوبیوں کے اپنے نہیں شکر گذار
لوگ جب عیب ہمارا کوئی سُن پاتے ہیں　　گو کہ کرتے ہیں تاسّف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو ریج اُن کو کمال　　گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار

اور جو ہو گوش زد اُن کے کوئی خوبی اپنی — خوش تو پڑتی ہے بنائی اُنھیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم اُن کے — کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار
للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا — نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ تیار

شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال — انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اُس کی جب یہی دیکھی گئی روش — پوچھا کسی نے اُس سے کہ اس کا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اس لئے کی ہے یہ اختیار — چھُٹ جائے تا کہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک — آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار — منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا
اُمید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت — گر چند روز اور رہا ان سے سابقا

آیا جواب سن کے یہ اس کا بہت پسند! — کی آفریں اور اُس سے مخاطب نے یوں کہا
"نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ — حق میں ترے مفید ہیں یا یہ اُن سے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل — اہلِ وطن پہ اُن کی مگر جان ہے فدا
پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ — دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پسیجتا
انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور — جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ — شائستگی کا زہر ہے جب سے انھیں چڑھا

اسراف

ایک مُسرف نے یہ مُمسک سے کہا　　"کب تک اے ناداں یہ حبِّ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ　　ہے سدا دُنیا ہی میں رہنا مگر؟"

ہنس کے مُمسک نے کہا "اے سادہ لوح　　زر لٹانا رائگاں اور اس قدر
آج ہی گویا (نصیبِ دشمناں)　　آپ کا دُنیا سے ہے عزمِ سفر"

پاس نیک نامی

اے نیک نام شکر کر اللہ کا ادا　　جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک کا　　پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھ کو خوف خدا کا ہو اس قدر　　جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرورِ نیک نامی

گئی ہے حد سے گذر شیخ کی نکو نامی
گمانِ بد کبھی اُس کی طرف نہیں جاتا
جو اُس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اُس کو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کا مڈیکل امتحان

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل مگر پہلا سوارِ راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت سنگین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار

ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش وپس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگذشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار

دی سند گورے کو لکھ یعنی جس میں تصدیقِ مرض
اور یہ لکھا تھا کہ "سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکّے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار"
اور کہا کالے سے "تم کو مِل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اُس کی بیماری کا کیونکر اعتبار"

خودستائی

اَے دل! البشر وہ کون ہے جو خودستا نہیں پر خودستائیوں کے ہیں عنواں جُدا جُدا

جو زیورِ خرد سے معرّا ہیں سادہ لوح کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو اِن سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ پردوں میں کرتے ہیں اِسی مضمون کو ادا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دیدیا
کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل سائل کی ڈب میں مَیں نے دیا مال جب دکھا
پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے تجمّل یہ اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا

کچھ اس لئے کہ ہم بھی انھیں میں سے ہوں شمار　　اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اس لئے کہ اپنا ہو انصاف آشکار　　کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا

کہتا ہے ایک - لاکھ نہ مانے بُرا کوئی　　ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
کہتا ہے ایک - گر ہے خوشامد کا اور ہی　　پر چاہتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم بُرا
دھوکا ہُنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ　　اور مُنہ سے دُزدکہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا

چُپ چاپ سُن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں　　یعنے کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حُسنِ ظن ہے یہ　　اِک خاکسار کو جو دیا تُم نے یوں بڑھا
قائل ہے وہ انھیں پہ ہوئے وصف جو بیاں　　اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید عمرو ہے شدّت سے سادہ لوح　　گنتا ہے سب کو نیک وہ - اچّھا ہو یا بُرا
کہتا ہے عمرو - زید بھی گنتا ہے عیب ہیں　　بد ہو کہ نیک - اُس کی زباں سے نہیں بچا
یہ اُس کا اور وہ اِس کا بیاں کرکے کوئی عیب　　ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا

غیبت - اُمید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں　　ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خود ستا
حالی جو تیرے کھول رہے ہیں جہان کے　　شاید کہ اُس سے آپ کا ہوگا یہ مدعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب　　اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصّہ جس کو دیکھئے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملہ پہ اُس کے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اُس کے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پر ہمیشہ جس کے اِتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اِتنا بدنما نہیں جتنا اِسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اِس کا سبب کیا — جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کمتر — ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت

حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا — یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجبِ رقّت

کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُسوقت — جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت توانگر — پھر اُس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال — گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہو چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

رؤسائے عہد کی فیّاضی

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت
بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا،
بولے "آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
عاملانِ شہر مدعو اُس کے رہتے ہیں سدا
ضلع کے حکام کا ادنےٰ اشارہ چاہیئے
پھر کوئی دیکھے سخاوت اُس کی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں
اُن میں صرف اس کی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
پالکی یا ویگنٹ ہے جو سواری اُس کے پاس
اہلکاروں کے لئے ہے وقف بے چون و چرا
کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس

اُس کی ہمت کے ہیں سب مدّاح بے رُو و ریا"

جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ ۔ اُن سے حالی نے بصد منت کہا
"عیب بھی اُس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سُنتے سُنتے خوبیاں جی اپنا متلا نے لگا"

ایمان کی تعریف

فقیہہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف ۔ تو دی چراغ سے اُس کو بہ آب و تاب مثال
کہا "فتیلہ اقرار باللساں ہے ضرور[1] ۔ جہاں ہو آتش تصدیق و روغن اعمال"
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل ۔ نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جن میں ملاپ ۔ دولت و بخت ہے ہر حال میں اُن کے ہمراہ
نہ اُنھیں حاجت اعوان نہ تلاش انصار ۔ نہ اُنھیں خوف بد اندیش نہ بیم بدخواہ
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی ۔ اُس کی دُنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ

---

[1] یعنی کروسین آئل جو بغیر بتّی کے بھی جل سکتا ہے ۔ گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے ۔ ۱۲

نہ ملاذ اُن کے لئے قلعہ نہ خندق نہ فصیل ۔ نہ سفید اُن کے لئے فوج نہ لشکر نہ سپاہ"

ایک مُلّا نے سُنا جب یہ سخن ۔ فرمایا "تکیہ اور اس قدر اسباب پہ کرنا ہے گُناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں دستِ قُدرت کے ہے سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ کثرت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ"

کہا آزاد نے سچ ہے کہ "وہ دے ساتھ اگر کردیں افراد پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم اُس کو جب دیکھا ہے دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صوری مانعِ قُربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لئے شہر میں اِک گھر
جا اپنے محلے سے کہیں دور بنایا
جب اہلِ محلّہ سے چلا ہو کے وہ رُخصت
دل دردِ جُدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس
اِک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
"دِلّی ۔ کہ جو بے عقل ہے دم دیتی ہے گھر پر
اِتنی بھی محبت تمھیں گھر سے نہیں آیا؟"

حالی نے کہا "اُنس ہے چیز اور، وفا اور
بلّی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا
اُس مہر و وفا کی نہیں بلّی پہ پڑی چھینٹ
کتّے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا
ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی
گھر بھول گئے ہم تو نہیں تم کو بھلایا
گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا"

ناصح مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفر صادق رضؓ سے عرض کی
"محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کے بہرہ ور"
فرمایا "ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے اُمیدِ نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر"

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدّام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا

"کوئی آقا جبکہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیشِ خدمت اُس کے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا"

پر جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اِس کی کہ ہے خود خلق آقا کا بُرا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جس نے اور تمکین کو
اُس نے گویا ڈھا دیا رُکنِ رکیں اخلاق کا

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکّل کا تیر چڑیا پر ۔۔۔ ہو گیا اتّفاق سے جو خطا
ابنِ حمدوں ندیم تھا حاضر ۔۔۔ کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
"جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے ۔۔۔ خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ ۔۔۔ تو نے دی قصداً اُس کی جان بچا"

ابنِ حمدوں نے کی یہ دانائی ۔۔۔ کہ خوشامد سے یوں اُسے تھپکا
دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے ۔۔۔ ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
جائے کمبخت ابنِ حمدوں پر ۔۔۔ تیر کا اپنے امتحاں کرتا
ابنِ حمدوں کی جان گو جاتی ۔۔۔ دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیّت پر نااہل کو مسلّط کرنا

ہارون نے کہا۔ مصر لگا ہاتھ جب اُس کے　　"فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطۂ ملعون تھا یہی جس کی بدولت　　تھا دل میں خدائی کا خیال اُس کے سمایا
میں بھی اُسے اُس باغیٔ طاغی کے علی الرغم　　اک بندۂ بیقدر کو بخشوں گا خدایا"
کہتے ہیں خصیب ایک غلامِ حبشی تھا　　جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنتِ مصر کی باگ اُس کے حوالے　　نااہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
بارش گئی بہ ایک برس نیل کی رَو میں　　یہ حادثہ آ۔ اُس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ "روئی کی جگہ بوتے اگر اُون　　ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اُٹھایا"

ہاروں نے نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی　　محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا　　اپنے کو خدا جس نے ہے عالم کو بنایا
جوکھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی
اِک سفلۂ ناکس کی بنا اُس کو رعایا

رشک

ظاہرا مَردوں کی طینت میں نہیں رشک اس قدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں

ایک شہزادی۔ کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تخت شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں
سلطنت میں اُس کی تھا مردوں کو کُلّی اختیار
عورتیں اصلاً دخیل اُس کی حکومت میں نہ تھیں
مرد ہی تھے اُس کے محرم۔ مرد ہی اُس کے مشیر
تھا نہ عورت کا پتہ دربار میں اُس کے کہیں
تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنس کے فرمایا کہ "اے دولت کے ارکانِ رکیں
مرد ہونے کے سبب تُم سے نہیں مانوس ہیں
بلکہ ہے اُنس اِس لئے تم سے کہ تم عورت نہیں"
بات کی حُسنِ بیاں سے اُس نے دی صورت بدل
تا کہ کوئی سوءِ ظن اُس پر نہ کر بیٹھے کہیں
ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اِس لئے نفرت کہ ہے مردوں کی صورت دلنشیں

قانون

کہتے ہیں ہر فردِ انساں پر ہے فرض مانا قانون کا بعد از خدا
پر جو سچ پوچھو۔ نہیں قانون میں جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا

اُس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں　　اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا
پر اُسے دیتے ہیں توڑ اِک آن میں　　جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کمزوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زورمندوں کی ہے لا (LAW)

شادی قبل از وقت بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو　　تختِ پدر پہ اُس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ اُن مقننوں نے　　عالم میں آجکل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی　　کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنایا
نزدیک اُن کے گویا بزعمِ عقل و دانش　　ہے کنگڈم سے آساں سیڈم کو بس میں لانا

حرص

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ　　"قدر قلیل ہے سب مال و منالِ دُنیا"
گویا کہ حرص اُس کی اِس سے چھپی نہیں ہے　　ہے جس قدر فراہم پاس اُس کے مالِ دُنیا

امرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند　　وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت
پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں　　ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت

بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبا بیمار کو کچھ اس سے سوا اُن کی ہے حاجت

عصمت بی بی از بے چادری

اے بینواؤ! ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم اخلاق میں کچھ اُن کے اگر آگیا بگاڑ
تم زد سے نفس کی ہو بچے تب تک بچے ہوئے ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش گر تم کو ہوں نصیب تو دنیا کو دو اُجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

کھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ بازپرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ　　تمھاری ہر دم اے ارباب دولت
خوشامد پر نہ اُن کی بھولنا تم　　وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک　　نہیں اُن میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیر قیام سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح　　وہاں پانوں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اُس کے تھی یہ مشورہ دیتی　　"یہ حرف سُبک بھول کے مُنہ سے نہ نکالو"
پر راستے نے فرمایا کہ "جو کہتی ہے تدبیر　　مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن　　جو بات سُبک ہو اُسے مُنہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر　　مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی بُری گت
لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج　　واں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت؟
فرمایا کہ "ہوتے ہیں جہاں مرد جہاندار　　قبضہ میں ہے واں عورتوں کے دولت و حکمت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی
سمجھو کہ ہے اُس ملک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرور زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو   تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار
جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا   بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

کام اچھا کرنا چاہیئے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے   اُس میں کی تاخیر اُس نے جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا۔ یہ پوچھتا کوئی نہیں   بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا؟

گدائے مبرم

ایک برہمن مورتی کے سامنے باصد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں
آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا اُدھر
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جسم وہیں
جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
تاکہ پوجے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں
مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
بانوا بولا کہ ہے "تو بھی عجب کوتاہ بیں

مورتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہے وہ
ناحق اتنی التجائیں اس کے آگے تو نے کیں"

ہنس کے برہمن نے کہا "ہے مانگنا بندہ کا کام
دے نہ دے وہ" اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں

ہم نہیں دیتے ڈھئی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح
ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانوں پھیلاتے نہیں

بے اعتدالی

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو
ذرا وحشت اپنے سنو کان دھر کے

نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے

جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے

جو مجرے میں بیٹھو تو اُٹھو نہ جب تک
کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے

اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے

پڑا مُرغ بازی کا لپکا تو جانو
کہ بس ٹھن گئے عزم جنگِ تتر کے

چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے

جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو
کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے

جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی
رہیں پانوں کے ہوش جس میں نہ سر کے

جو کھانا تو بیحد جو پینا تو اَٹ گَٹ
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے [۱۵]

---

[۱۵] یعنی پیٹ بھر کے احمق - احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں گویا مخاطب کے سوا کسی پر اس کی حماقت ظاہر کرنا نہیں چاہتے - ۱۲

طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہے ہر بشر کو ملال　　کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے　　تو اور بھی اُسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طبیب ملول　　جو چل بسے کوئی اُن کے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ ٹھپ جائیگی خطا ہم پر　　کیا ملال کا اپنے گر اس جگہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی　　پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اُس سے کار نمایاں کوئی اگر　　کرتا ہے بار بار بیاں اُس کو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیئے　　ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اِک جُدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُس کو یاد　　یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد یہ انساں کو چاہیئے　　آخر بشر کا خاصّہ ہے سہو اور خطا

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں　　اپنے دعوؤں پہ بیاں کر کے دلیل و بُرہاں

مغلوب ۱۲

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی — درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں
ہے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی — جس کا آتا ہے نظر بیشتر از صبح زیاں
سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز — تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں
نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر — یہ بھی ہے نیند کوئی موت کا ہے جس پہ گماں
نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں شکیب — کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں
کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو — دیکھ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں
ہاتھ دھو لذّت فانی سے نہیں گر منظور — عیش باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں
نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضر طریق — وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجئے جاں
پر نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل — گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں
نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی امید — کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں
ہے یہ ایک ایک مری لذّتِ فانی وہ بلا — سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جس پر قرباں
ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ دے قابِ طعام — ایک مدعو اسے کرتا ہے پس از سال رواں
کیونکہ امید پہ اک مائدۂ نعمت کی — سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں
عقل نے سن کے کہا خوف ہے تجھ سے اے نفس — جز بزہ تیرا تجھے دیکھئے پہنچائے کہاں
حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل سرسبز — کیجئے لاکھ بیاں اس پہ دلیل و برہاں
جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر — زہر دانستہ کرے نوش نہیں یہ امکاں

نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھو یہ لقمۂ نقد
اس کے کھانے میں نہیں جاں کی خیر اے ناداں

فضول خرچی کا انجام

سرِ رہِ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف — جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش — سخی ہو اس میں کہ مُمسک غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولتمند — کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اس راہ سے گزر اُس کا — درم اک اُس نے بھی چاہا کہ کیجے نذرِ فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت — کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر
یہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار — کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اللّے تللّے رہے تو آپ کو بھی — ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر

سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے
دکھائے دیکھئے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

اختلاف مذاہب رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اُٹھ جائے دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم اہلِ مذہب میں خلاف
ہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ موردِ آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار دو ہیں اُن میں سے نہایت جانگزا
ایک فکر اُس آنے والے وقت کی شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
اور بھی حیوانِ ناطق کے لئے ہیں بہت سی زحمتیں اِن کے سوا
پرگدھے اور اور حیوانات سب رہتے ہیں دور-اِن گزندوں سے سدا
کیسا اِن آلام سے رہتا پخنت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ "اس کام کا آخر انجام
بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام
آنکھ میں اپنے پرائے کے ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام

جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ ہونا کوئی بیچ
جس سے دُنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام
ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
نفس سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ "انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اس زہر ہلاہل کا کوئی بھول کے نام
یہ تو کہتے ہو کہ انجام بُرا ہے - لیکن
یہ بتاؤ کہ بُرا ہوتا ہے کیسا انجام؟
بُرے انجام کی تب ہو گی حقیقت روشن
بُرے انجام سے جب آکے پڑے گا خود کام
مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اک مُسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
"پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر

چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہلِ ملک کو
گو کہ اُن کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ راجس کے کبھی جا کو نہ لیں
اُس کا ہو بے چارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انھیں
اُن کو لندن سے منگائیں بس چلے اِن کا اگر
الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا۔ قصّہ مختصر

سُن کے حالی نے کہا ؏ ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اِس عیب میں آلودہ تر
ہیں محبّت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کے
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبُول اس پہ ہے طبعِ بشر
مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاس قوم میں
اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر
ہاں بَری اس عیب سے لے دے کے اِس دُنیا میں ہے
چشمِ بد دور اُمّتِ مرحوم اے جانِ پدر

اور قوموں سے اِنھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہو گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یاں
جس قدر ہے۔ اِن سے اپنوں اور بیگانوں کو خطر"

برکھا رُت

مرتبہ ۱۸۷۴ء

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لئے کتابِ عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات — وہ کون خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان — سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار — اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا — اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں — اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں مُنہ چھپائے — اور ہانپ رہے تھے چارپائے

تھیں لومڑیاں زباں نکالے — اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ — ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سُدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سُست — گھڑیال تھے رود بار میں سُست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا — بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں — اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چھُٹا تھا گھاس دانہ — تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — اور اُنس نکل رہا تھا سب کا
طوفاں تھے آندھیوں کے برپا — اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لُو کے چلتے — شعلے تھے زمین سے نکلتے
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام — تھا آگ کا نام مُفت بدنام
رستوں میں سوار اور پیدل — سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بیکل
گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں — ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک — پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی — وہ بادِ سموم سے سوا تھی
بُجھتی نہ تھی آتشِ درونی — لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک — جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک
ٹٹی میں تھا دن گنواتا کوئی — تہ خانے میں مُنہ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سنسان — آتی تھی نظر نہ شکل انسان

چلتی تھی دُکان جن کی دِن رات — بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہاتھ
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا — یا پیاؤ یا سبیل پر تھا
تھا شہر میں قحط آدمی زاد — سلطان کا اِک کنواں تھا آباد[1]
پانی سے تھی سب کی زندگانی — میلا تھا وہیں جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں لپکتی — فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
پھل پھول کی دیکھ کر طراوٹ — پاتے تھے دل و جگر طراوٹ
کنجڑوں کی وہ بولیاں سُہانی — بھر آتا تھا سُن کے مُنہ میں پانی
تھے جو خفقانی اور مراقی — گرمی سے نہ تھا کچھ اُن میں باقی
کھانے کا نہ تھا اُنھیں مزا کچھ — آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
بن کھائے کئی کئی دن اکثر — رہتے تھے فقط کٹھنڈائیوں پر
شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے — مر پیٹ کے صُبح تھے پکڑتے
اور صُبح سے شام تک برابر — تھا العطش العطش زباں پر
بچّوں کا ہوا تھا حال بے حال — کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دم — تھے پانی کو دیکھ کرتے مَم مَم
ہر بار پُکارتے تھے ماں کو — ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لاکر — پھر چھوڑتے تھے نہ مُنہ لگا کر

---

[1] لاہور میں جہاں یہ مثنوی لکھی گئی ایک سُلطان کا کنواں مشہور ہے جس کا پانی نہایت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں وہاں آدمیوں کا نہایت ہجوم رہتا ہے۔

بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر — تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر

تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری — پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور — پر رات سے ہی سماں ہے کچھ اور

پُروا کی دُہائی پھر رہی ہے — پچھوا سے خُدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اِک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے

ہیں رنگ برنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی — ایک آتی ہے فوج ایک جاتی

جاتے ہیں مُہم پہ کوئی جانے — ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی — چھاتی ہے زمین کی دہلتی

مینھ کا ہے زمین پر دیڑیڑا — گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی — آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنّت کی ہوائیں آرہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قُدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہے مُنہ پر — اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت — کھیتوں کو مِلا ہے سبز خلعت

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور — ہے چار طرف برس رہا نور

بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار — اٹکل سے ہیں راہ چلتے راہوار

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی — عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار — دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل — ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو — اور مور چنگھارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی — گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے — سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر — پانی میں مگر، کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست — قلاّش ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر — کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ہیں وردِ اہلِ تقویٰ — یَا رَبِّ لَنَا وَلَا عَلَیْنَا
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا — کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی — گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملار گاتا — ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشہ میں گاتے پھرتے — اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سروَن کوئی گا رہا ہے بیٹھا — چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے — ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے
کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھیا — تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

ہیں شکر گزار تیرے برسات — انسان سے لے کے تا جمادات
دُنیا میں بہت تھی چاہ تیری — سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے ہے کھُلا یہ رازِ قدرت — راحت ملتی ہے بعد کلفت
شکریہ فیضِ عام تیرا — پیشانی دہر پر ہے لکھا
گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاؤس کو ناچنا بتایا — کوئل کو الاپنا سکھایا
جب مور ہے ناچنے پہ آتا — آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا
کوئل کو نہیں قرار اک پل — ایسی کوئی تو نے کوک دی کل
شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں — کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا — اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن — کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ — اِک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ
دریا تجھ بن سِسک رہے تھے — اور بن تیری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان — اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی — ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی
جو دانے تھے خاک میں پریشان — سب آ کے چڑھائے تو نے پروان
دولت جو زمین میں تھی مخفی — آ گئے ترے اُس نے سب اُگل دی
پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر — وہاں سبزہ و گل ہیں جلوہ گُستر

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے — باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے — واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار — ہے بیر بہٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں — جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن — جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری — اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مِلکے گاتی — جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اِک سب کو کھڑی جھُلا رہی ہے — اِک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے اُن میں کوئی ملار گاتی — اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کوئی کبھی ہنڈولا — کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اِک جھولے سے وہ گری ہے جاکر — سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں — تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی — اور تیر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی — مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے — دن بھر میں ہیں بڑے جا کے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی — موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں — موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں

ملاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان — بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجدھار کی رو زور پر ہے — مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

بیزار اک اپنے جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غمخوار ہے کوئی اور نہ دلجو — اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم — اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھونکے — تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے — یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گُن گُنانا — اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
اے چشمۂ آبِ زندگانی — گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری — بستی ہے اُسی طرف ہماری
پائے جو کہیں میری سبھا کو — دیتا ہوں میں بیچ میں خُدا کو
اوّل کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمھاری آئی برکھا

آتا ہے تمھارا دھیان جس دم　　مُرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یونہیں صُبح و شام اکثر　　تالاب میں تیرتے تھے جا کر
جب سبزہ و گُل ہیں لہلہاتے　　صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہیں ہاتھ میں دئے ہات　　پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا　　میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو　　دیتا ہوں دعائیں سب لے کسی کو
رُت آم کی آئے اور نہوں یار　　جی اپنا ہے ایسی رُت سے بیزار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی　　چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی　　پر دل میں ہے آگ سی سُلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد　　جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چُبھتی　　فریاد یہ دردناک اُس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز　　بکڑا دل سُن اُس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر　　رو رہا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالیؔ

نشاطِ اُمید

ارتبرؔ ۱۸۶۹ء

اے مری اُمید میری جاں نواز　　اے مری دلسوز میری کارساز

میری سپر اور مرے دل کی پناہ — درد و مصیبت میں میری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری شفیق — کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
کاٹنے والی غمِ ایام کی — تھامنے والی دلِ ناکام کی
دِل پہ پڑا آن کے جب کوئی دُکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سُکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اُٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ
جی کو ہوا گر کبھی عُسرت کا رنج — کھول دیئے تو نے قناعت کے گنج
تُجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس
خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو — عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو
نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو — چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو
رام کے ہمراہ چڑھی رَن میں تو — پانڈوں کے ساتھ پھری بن میں تو
تو نے سدا قیس کا بہلایا دل — تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل
ہوگیا فرہاد کا قصہ تمام — پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس — ہیر تھی فرقت میں کبھی گویا کہ پاس
ہوتی ہے تو پُشت پہ ہمت کی جب — مُشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب
ہاتھ میں جب آکے لیا تو نے ہاتھ — سات سمندر سے گزرنا ہے بات
ساتھ مِلا جس کو ترا دو قدم — کہتا ہے وہ یہ ہے عجب اور عجم
گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ — سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ
عزم کو جب دیتی ہے تو میل حیت — گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست

توُنے دیا آ کے اُبھارا جہاں ۔۔۔ سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں
ذرّے کو خورشید میں دے تو کھپا ۔۔۔ بندے کو اللہ سے دے تو ملا

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ ۔۔۔ دین کی تو اصل ہے دُنیا کی جڑ
نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس ۔۔۔ تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس
دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو ۔۔۔ تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو
خشک تھا بن تیرے درختِ عمل ۔۔۔ تو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل
دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حور ۔۔۔ گاہ دکھاتی ہے شرابِ طہور
نام ہے سدرہ کبھی طوبےٰ ترا ۔۔۔ روز نرالا ہے تماشا ترا
کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل ۔۔۔ جلوے ہیں سب تیرے یہ بیقال و قیل
روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ ۔۔۔ ہے کہیں فردوس کہیں ہے سُرگ
ایک سے ہے ایک انوکھا برن ۔۔۔ ہے کہیں محشر کہیں آوا گون
ایک ادا ہیں تیری لاکھوں رشی ۔۔۔ کھپ گئے جن کی نہ خبر کچھ ملی
کوہ ہمالہ میں بہت حیا گلے ۔۔۔ اور تپیّشا میں بہت جل بجھے
تیرے تصوّر میں ہزاروں ولی ۔۔۔ ڈوبے کچھ ایسے کہ نہ اُچھلے کبھی
پڑھ دیا زاہد پہ کچھ ایسا فسوں ۔۔۔ دل کی تپش اُس کی ہے ہر دم فزوں
کر دیا راہب پہ خدا جانے کیا ۔۔۔ ہو گیا دُنیا سے وہ بیزار سا
جس کو غرض دیکھئے دُھن ہے یہی ۔۔۔ صوفیِ صافی ہو کہ ہو مولوی

نشۂ امید میں ہیں چور سب　　ایک پیالہ سے ہیں مخمور سب

جب ہمایوں سے چھٹا ملک و تخت　　اور پھنسا بند حوادث میں سخت
یار رہا اور نہ کوئی غمگسار　　دوست و دشمن کے لگے چلنے وار
پھر گئے دلدادۂ فرماں تھے جو　　چھٹ گئے وابستۂ داماں تھے جو
گھر میں نہ رہنے کی ملی کوئی راہ　　ملک میں لی غیر کے جاکر پناہ
ہو گئے اغیار یگانے سبھی　　تو نے مگر ساتھ نہ چھوڑا کبھی
چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید　　ایک نہ چھوڑی تو نے چھوٹی امید
تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت　　تیرے ہی صدقہ سے ملا تاج و تخت
خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند　　تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند
تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں　　تو نہ ہو تو ہوا بھی برہم جہاں
کوئی پڑا پھرتا ہے بہر معاش　　ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش
ایک تمنائیں ہے اولاد کی　　ایک کو دلدار کی ہے لَو لگی
ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے　　دھوم سے اولاد کی شادی رچائے
ایک کو کچھ آج اگر مل گیا　　کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا
قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک　　جس میں ہو ان کے لئے انجام نیک
ایک کو ہے تشنگی قرب حق　　جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق
جو ہے غرض اس کو نئی جستجو　　لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو

تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ — گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ
سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد — کہتی ہے جب تو کہ آب آئی مراد
وعدہ تیرا راست ہو یا ہو دروغ — تو نے دئے ہیں اسے کیا کیا فروغ
وعدے وفا کرتی ہے گو چند تو — رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو
کھاتی ہے سب کو تیری لیت و لعل — تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل
تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے — بزم عزا کو طرب آگیں کرے
آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس — رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس
پاس کا پاتی ہے جو تو کچھ لگاؤ — سیکڑوں کرتی ہے اتار اور چڑھاؤ
آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس — ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس
جن کو میسر نہیں کملی پھٹی — خوش ہیں توقع پہ وہ زربفت کی
چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ — بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ
پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق — گھوڑا جو سبزہ تو نیلا ہو طوق
فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب — دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب
تیرے کرشمے ہیں غضب دل فریب — دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب
تجھ سے مہوس نے جو شوری لیا — پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا
دل سے بھلا یا زن و فرزند کو — لگ گیا گھن نخل برومند کو
کھانے سے پینے سے ہوا سیر جی — ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی
دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام — دھن ہے یہی رات دن اور صبح و شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا   شہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا
پیسے کو جب تاؤ یہ دیتا ہے تاؤ   پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ
کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر   رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر
ہے اسی دھندے میں وہ آسودہ حال   تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال
تول کر گر دیکھئے اُس کی خوشی   کوئی خوشی اُس کو نہ پہنچے کبھی
پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت   جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت
آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو   ملتی ہے مشکل سے اُنھیں نان جو
تیرے سوا خاک نہیں اُن کے پاس   ساری خدائی میں ہے لے دے کی آس
بھولے سمائے نہیں اِس آس پر   صاحب عالم اُنھیں کہیئے اگر
کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب   جھوٹے کو ہو تخت نہ یارب نصیب

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم   آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے   حوصلہ کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ   عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے   پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح   یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا   اُڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی   ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی

جاتا ہے قابو سے دِل آخر نکل کرتی ہے اِن مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی ہو گئی کافور سب افسردگی
تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید
چھوڑ یو حالی کا نہ ساتھ اے اُمید

حُبِّ وطن

اے سپہر بریں کے سیّارو اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کی نغمۂ سحری اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھوکو دھرِ ناپائدار کے دھوکو
تم ہر اِک حال میں ہو یوں تو عزیز تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رہنا تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تُم مری دل لگی کے ساماں تھے تم مرے درد دل کے درماں تھے
تُم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اِک اِک تمہاری بھاتی تھی جو ادا تھی وہ جی لُبھاتی تھی
کرتے تھے جب تُم اپنی غمخواری دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب — دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال — شبِ مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا — جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں — تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دُنیا — پر نہیں ہم کو لُطف دُنیا کا

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے موردِ آلام — تیرے چُھٹنے سے چُھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لُطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا — اُن کو کیا ہو گا زندگی کا مزا
ہو گیا یہاں تو دو ہی دن میں یہ حال — تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک اک سال
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار　　یا کہ دُنیا ہے تیری عاشق زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں　　اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو　　مُرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کا نمو تجھ سے　　روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما　　سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اِک مشت خاک کے بدلے　　لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا　　کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا

حملہ جب قوم آریہ نے کیا　　اور بجا اُن کا ہند میں ڈنکا
ملک والے بہت سے کام آئے　　جو بچے وہ غلام کہلائے
شدر کہلائے راکشس کہلائے　　رنج پردیس کے مگر نہ اُٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبّا　　نہ چُھٹا اُن سے دیس پر نہ چُھٹا

قدر اے دل وطن میں رہنے کی　　پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رام چندر کو بن باس　　اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر　　پر چلا ساتھ لے کے داغ جگر
پاؤں اُٹھتا تھا اُس کا بن کی طرف　　اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف

گزرے غربت میں اس قدر مہ و سال　　پر نہ بھولا اجدھیا کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا　　دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آکے لگتا تھا　　آتی تھی جب اجدھیا کی ہوا
کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال　　گویا ایک ایک جُگ تھا ایک ایک سال

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی　　سید البطحیٰ کے ہمراہی
رشتے الفت کے سارے توڑ چلے　　اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا　　پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں　　پر نہ بھولے وطن کے ریگستاں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے　　سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا　　دل سے رشتہ نہ اُن کا ٹوٹا تھا

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور　　اور ہوا ملک مصر پر مامور
مصر میں چار سو تھا حکم رواں　　آنکھ تھی جانب وطن نگراں
یاد کنعاں جب اُس کو آتی تھی　　سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اُٹھائے تھے جس وطن میں سخت　　تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بے مہری　　لَو تھی اُن بھائیوں کی دل کو لگی

ہم بھی حُبِ وطن میں گو ہیں غرق | ہم میں اور اُن میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نامِ وطن کے دیوانے | وہ تھے اہلِ وطن کے پروانے
جس نے یوسف کی داستاں سُنی | جانتا ہوگا روئداد اُس کی
مصر میں قحط جب پڑا آکر | اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر
کر دیا وقف اِن پہ بیت المال | لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال
کھتیاں اور کوٹھے کھول دیے | مُفت سارے ذخیرے تول دیے
قافلے خالی ہاتھ آتے تھے | اور بھر پور یہاں سے جاتے تھے
یوں گئے قحط کے وہ سال گزر | جیسے بچّوں کی بھوک وقتِ سحر

اَے دِل اَے بندۂ وطن ہشیار | خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
او شرابِ خودی کے متوالے | گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے
نام ہے کیا اِسی کا حُبِّ وطن | جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے | کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی | لو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار | پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے | یہ بھی اُلفت میں کوئی الفت ہے
اِس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند | اِس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگِ غربت میں | سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آ کے کابل سے یہاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارور ز نہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہات دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر دور
اُس کو جینے کا پھر نہیں مقدور
گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے اُن کے پڑتے ہیں
گائے یا بھینس اونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
کہیے حُبِّ وطن اِسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
سمجھے اُن کی خوشی کو راحتِ جاں
واں جو نوروز ہو تو عید ہو یہاں
رنج کو اُن کے سمجھے مایۂ غم
واں اگر سوگ ہو تو یہاں ماتم
بھول جائے سب اپنی قدرِ جلیل
دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل
جب پڑے اُن پہ گردشِ افلاک
اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ　　دِل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک　　کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ　　ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار　　زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا　　اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو　　واں میسّر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی　　جن پہ پڑتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ　　کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر　　ہے کوئی اُن میں خشک اور کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند　　کوئی آزردہ ہے کوئی خورسند
مقبلو مدبروں کو یاد کرو　　خوش دلو غم زدوں کو شاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ　　تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر　　لو جو لی جائے کو رو کر کی خبر
تم اگر ہات پاؤں رکھتے ہو　　لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو
تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ　　رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ
تم اگر چاہتے ہو مُلک کی خیر　　نہ کسی ہموطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی　　جین مت، ہووے یا ہو بشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہات دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہوگیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہات پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام — کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام
ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم — پڑتی جو سر پہ وہ اٹھاتے تم
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے

قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ — سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ
اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا — کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
شہر میں قحط کی دوہائی ہے — جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے
بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا — موت کی مانگتا ہے کوئی دعا

بچے اِک گھر میں بلبلاتے ہیں　　روکے ماں باپ کو رُلاتے ہیں
کوئی پھرتا ہے مانگتا در در　　ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر
پر جو ہیں اُن میں صاحب مقدور　　اُن میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور
کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہوگا　　اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا
جتنے دیکھو گے پاؤ گے بے درد　　دل کے نامرد اور نام کے مرد
عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات　　عید ہے دن تو شبرات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے　　کام اُنھیں اپنے حلوے مانڈے سے
ان کو اب تک خبر نہیں اصلا　　شہر میں بھاؤ کیا ہے غلّے کا
غلّہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں　　کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں
کال کیا شئے ہے کس کو کہتے ہیں بھوک　　بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مفلوک
سیر کھوکے کی قدر کیا سمجھے　　اُس کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

اہلِ دولت کا سُن چکے تم حال　　اب سنو روئداد اہلِ کمال
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد　　پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا　　ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا
رہتے دو اہل علم ہیں اس طرح　　پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح
عیدو[1] والوں کا ہے اگر پٹّھا　　شیخو والوں میں جا نہیں سکتا

---

[1] عیدو والے اور شیخو والے پہلوانوں کے دو متقابل گروہ دلّی میں تھے جن میں سے ایک کے سرگروہ اور اُستاد کا نام عیدو اور دوسرے کا شیخو تھا۔

شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار — خوشنویسوں کو ہے یہی آزار
لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو ایک نیک — دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک
اِس پہ طُرّہ یہ ہے کہ اہلِ ہُنر — دور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر
رلی اِک گانٹھ جس کو ہلدی کی — اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری
نسخہ اِک طِب کا جس کو آتا ہے — سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
جس کو آتا ہے پھونکنا کشتہ — ہے ہماری طرف سے وہ گونگا
جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات — وہ نہیں کرتا سیدھے مونھ سے بات
باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا — بھید پاتا نہیں منجّم کا
کام کندلے کا جِس کو ہے معلوم — ہے زمانہ میں اُس کے بخل کی دھوم
الغرض جس کے پاس ہے کچھ چیز — جان سے بھی سوا ہے اُس کو عزیز
قوم پر اُن کا کچھ نہیں احسان — اُن کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں
سب کمالات اور ہُنر اِن کے — قبر میں اِن کے ساتھ جائیں گے
قوم کیا کہہ کے اِن کو روے گی — نام پر کیونکہ جان کھوئے گی
تربیت یافتہ ہیں جو یہاں کے — خواہ بی۔ اے ہوں اس میں یا ایم۔ اے
بھرتے حُبِّ وطن کا گو دم ہیں — پر مُحبِّ وطن بہت کم ہیں
قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھیں — اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں
ہسٹری اِن کی اور جو گرفی — سات پردوں میں مونھ دیئے ہیں پڑی
بند اُس قفل میں ہے علم اُن کا — جِس کی کُنجی کا کچھ نہیں ہے پتا

لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے — گویا گونگے کا گڑ ہیں کھائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں سیرِ گل تنہا — کوئی پاس اِن کے جا نہیں سکتا
اہلِ انصاف شرم کی جا ہے — گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ — تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ
یہ جو دولت تمھارے پاس ہے آج — ہم وطن اِس کے ہیں بہت محتاج
مُنہ کو ایک ایک تمھارے ہے تکتا — کہ نکلتا ہے مونھ سے آپ کے کیا
آپ شائستہ ہیں تو اپنے لئے — کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیجئے
میز کرسی اگر لگاتے ہیں آپ — قوم سے پوچھئے تو پُن ہے نہ پاپ
سنڈا جوتا اگر آپ کو ہے پسند — قوم کو اس سے فائدہ نہ گزند
قوم پر کرتے ہو اگر احساں — تو دکھاؤ کچھ اپنا جوشِ نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو — پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو
علم کو کر دو کُو بہ کُو ارزاں — ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
سُنتے ہو سامعین با تمکین — سنتے ہو حاضرین صدر نشین
جو ہیں دُنیا میں قوم کے ہمدرد — بندۂ قوم اُن کے ہیں زن و مرد
باپ کی ہے دعا یہ بہرِ پسر — قوم کی میں بناؤں اُس کو سپر
ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد — قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں — تم اگر مال دو تو میں دوں جاں
اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں — ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری　　دَخل اور خرج جن کے ہیں بھاری
اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم　　بحثِ حکمت و ادب قائم
نِت نئے کھُلتے ہیں دواخانے　　بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے
ملک میں جو مرض ہیں عالمگیر　　قوم پر اُن کی فرض ہے تدبیر
ہیں سدا اس اُدھیڑ بُن میں طبیب　　کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب
قوم کو پہنچے منفعت جس سے　　ملک میں پھیلیں فائدے جس کے
رسم بد کا اثر جہاں پایا　　حملہ پر حملہ اُس پہ ہونے لگا
کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر　　کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر
ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے　　دوسرا اُس کو کر دکھاتا ہے
لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں　　آخر اُس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں
قوم کی خاطر اُن کے ہیں سب کام　　خواہ اس میں سفر ہو خواہ مقام
سیکڑوں گل رُخ اور ماہ پارے　　لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے
جان اپنی لئے ہتھیلی پر　　کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر
شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے　　پر کوئی بات کام کی ہات آئے
جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل　　ملک کا آئے کوئی کام نکل
کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں　　مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں
لکھے جب تک جیئے سفرنامے　　چل دئے ہات میں قلم تھامے
گو سفر میں اُٹھائے رنج کمال　　کر دیا پر وطن کو اپنے نہال

ہیں اب اُن کے گواہ حبِّ وطن
در و دیوار پیرس و لندن

کہیے دُنیا کا جس کو باغ جناں
ہے فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہیں سب بشر کے ہم وطنو
تم سے بھی ہو سکیں تو مرد بنو

چھوڑ دو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں
رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں

قافلوں سے اگر ملا چاہو
ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکالو ذلت سے

اُن کی عزت تمھاری عزت ہے
اُن کی ذلت تمھاری ذلت ہے

قوم کا مبتذل ہے جو انساں
بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں

قوم دُنیا میں جس کی ہے ممتاز
ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

عزتِ قوم چاہتے ہو اگر
جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہُنر

ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

اب نہ سیّد کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو (شُدر) پر ترجیح

ہوئی ترکی تمام خانوں کی
کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی

قوم کی عزت اب ہُنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے

کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہُنر بھیک تک نہ پائے گا

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

مناظرہ رحم و انصاف

مرتبہ ۱۸۶۷ء

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا — کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیکنامی سے ترے سخت تحیر ہے ہمیں — ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کونسی خوبی تجھ میں
دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں — آنکھ میں تیری مروت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں — دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں
قتل انساں ہمیشہ سے ہے عادت تیری — سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری
جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے — اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے
فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے — آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے
قید خانوں میں جہاں کے ہے بڑا غل تیرا — جتنے قیدی ہیں تری جان کو دیتے ہیں دعا
تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سر تن سے جدا — اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مسکن سے جدا
لطف ہے تیری طبیعت میں نہ کچھ جوش غضب — تجھ کو خردوں پہ شفقت نہ بزرگوں کا ادب
کانپتے آتے ہیں محفل میں تری شاہ و گدا — تجھ سے کتراتے ہیں احباب ہوں یا ہوں اعدا
جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست — یار ہندو کا ہے اور نہ مسلمان کا دوست
نہیں جائز ترے مذہب میں کسی کی امداد — تیرے نزدیک برابر ہے غلام اور آزاد
دم میں تو صحبتِ دیرینہ بھلا دیتا ہے — دوستی خاک میں برسوں کی ملا دیتا ہے
طور برتاؤ کا ہے سب سے نرالا تیرا — تجھ سا روکھا کوئی دنیا میں نہ دیکھا نہ سنا

ہر حال پہ تو اپنی جہاں نام خدا آجائے
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کا گلا کٹ جائے

اسی کرتوت پہ اے عدل یہ دعوے ہیں تجھے
کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے

ایک تو ہے کہ یگانوں کے ہیں دل تجھ سے فگار
ایک میں ہوں کہ نہیں غیر کبھی مجھ سے بیزار

رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام میرا
فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام میرا

حق کے الطاف و عنایت کا بہانہ ہوں میں
خلق کی کام روائی کا یگانہ ہوں میں

میری سرکار میں ہو جاتے ہیں سب عذر قبول
میرے دربار سے جاتے نہیں مجرم کبھی ملول

لطف ہے عام سدا اہلِ خطا پر میرا
ہاتھ اٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

غم مرے سامنے شادی سے بدلجاتے ہیں
ہنستے جاتے ہیں جو یہاں روتے ہوئے آتے ہیں

مجرئی شرم و مروّت مرے دربار کے ہیں
بخشش و جود ملازم مرے سرکار کے ہیں

موج زن ہوتا ہے جب فیض کا میرے قلزم
پاس ہو جاتی ہے انبوہ میں امید کے گم

مصر میں قید سے یوسفؑ کو نکالا میں نے
اور ایوبؑ کے بیڑے کو سنبھالا میں نے

میں ہر ایک درد میں ہو جاتا ہوں انساں کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک

میں ہی دیتا ہوں یتیموں کو دلاسا جا کر
میں ہی لیتا ہوں برے حال میں رانڈوں کی خبر

میرے ہی دم سے ہے آدم کا نمونہ باقی
میرے ہی دم سے ہے عالم میں نمودِ بشری

ورنہ انسان کہ ہے جرم و خطا کا پتلا
میں نہ ہوتا تو بھلا اس کا ٹھکانا کیا تھا

بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا
میں وہاں ساحلِ دریا پہ کھڑا روتا تھا

تجھ سے ہوتے اگر اے عدل جہاں میں دو چار
لٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے گلشن کی بہار

جب سُنا رحم سے یہ ولولہ انگیز خطاب — کہا انصاف نے ہو حکم تو دوں اس کا جواب

آپ کی نیکیوں سے کس کو ہے انکار یہاں — کیونکہ ہے ذکرِ جمیل آپ کا مشہور جہاں

مگر اے رحم بُرا ماننے کی بات نہیں — نیکیاں آپ کو کردیں نہ یہ بدنام کہیں

ہم نے مانا کہ مروّت بھی بڑی ہے اک چیز — پر مروّت کے لئے شرط ہے اے دولتِ تمیز

کھو دیا جس نے مروّت کو یہاں عام کیا — اُس کو رسوا کیا اور آپ کو بدنام کیا

بول میٹھے نہیں آفت کے یہ پرکالے ہیں — اس مروّت نے تری سیکڑوں گھر گھالے ہیں

دوستوں کو ہے اشارہ کہ کسی سے نہ ڈرو — دشمنوں سے یہ مدارا کہ جو چاہو سو کرو

چور چوری سے نہیں ڈرتے بدولت تیری — لئے پھرتی ہے اچکّوں کو حمایت تیری

جتنے قزّاق ہیں یہاں اُن کا مددگار ہے تو — اور سب ڈاکوؤں کا قافلہ سالار ہے تو

ہوا جس ملک پہ سرکار کا جاری فرماں — اُس کو سمجھو کہ ہوا اب کوئی دن میں ویراں

باپ کا حکم نہیں مانتے فرزندِ رشید — اور نوکر نہیں دیتے کبھی آقا کو رسید

لڑکے اُستاد کی گھُڑکی کو نہیں مانتے کچھ — بدمعاش اہلِ پولس کو نہیں گردانتے کچھ

اہلکاروں کا کچہری میں جو دیکھو بیوہار — سمجھو دیوان عدالت کو کہ ہے اک بازار

پیٹ پکڑے ہوئے وہاں پھرتے ہیں حاجت والے — اور مُنھ کھولے ہوئے بیٹھے عدالت والے

نہیں حاکم کی مروّت سے انھیں خوفِ مآل — "بول کیا لایا ہے" اظہار کا پہلا ہے سوال

ہر طرف بیچ میں دلّال ہیں کچھ چھوٹ رہے — دونوں ہاتھوں سے غرضمندوں کو ہیں لوٹ رہے

یوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت — خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت

ایک رہزن کو جو تو قید سے چھڑواتا ہے — بیسیوں قافلوں کو جان سے لٹواتا ہے

باپ کو ہونے نہیں دیتا جو بیٹے سے خفا
بے ادب رکھنا اُسے چاہتا ہے تو گویا

مار پڑ اُٹھنے نہیں دیتا جو اُستاد کا ہاتھ
یہ سلوک اچھے نہیں ہیں ترے شاگرد کے ساتھ

میٹھی باتوں میں تری زہرِ ہلاہل ہے بھرا
تیرا آغاز تو اچھا ہے پہ انجام بُرا

کاش تو بھی مرے قانون پہ چلتا اے رحم
اپنے اندازہ سے باہر نہ نکلتا اے رحم

بے مروّت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

راستبازی جو ستی ہو وہ طبیعت ہے مری
اور عدالت جسے کہتے ہیں وہ عادت ہے مری

معتدل نام ہے جسکا وہ مزاج اپنا ہے
بھاگ اُس ملک سے جس ملک میں راج اپنا ہے

میں ہی تھا جس نے کہ ویرانوں کو آباد کیا
میں ہی تھا جس نے کہ اخباروں کو آزاد کیا

حکم سے میرے ہوئی کونسلوں کی ماموری
رائے سے میری بنیں سلطنتیں جمہوری

کھو دیا میں نے نشاں سلطنتِ شخصی کا
اور دُنیا سے غلامی کو مٹا کر چھوڑا

مجلسیں سیکڑوں ملکوں میں بٹھائیں میں نے
راہیں اغلاط سے بچنے کی سُجھائیں میں نے

حکم و قانوں کسی گھر میں مقیّد نہ رہا
سلطنت نام ہے اب قوم کی پنچایت کا

جس طرح ظلم کا اے رحم روا دار نہیں
میں اُسی طرح سے تیرا بھی مددگار نہیں

سر ذرا جس نے اُٹھایا اُسے کھو کر چھوڑا
باپ کی ناؤ کو دریا میں ڈُبو کر چھوڑا

حکم عالم میں مرا شرق سے تا غرب ہے عام
جس نے مانا نہ مرا حکم رہا وہ ناکام

رائے کرتی نہیں میری کسی حالت میں خطا
تیر لگتا ہے مرا جا کے نشانے پہ سدا

میں دکھا دیتا سیاست کی گر اپنی تلوار
چل نہ سکتا کبھی قابیل کا ہابیل پہ وار

کارفرما ہے جہاں میری عدالت اے رحم
دم نہیں مارتی واں تیری مروّت اے رحم

وہاں تعصب کا پتہ اور نہ عداوت کا گزر — نہ قرابت کا نشاں اور نہ محبت کا اثر

حکم جاری ہے جدھر دیکھئے آزادی کا — بڑھ کے چلتا نہیں وہاں شاہ سے لے تا بہ گدا

کجروی مکر سے کہتی ہے میں آئی تو چل — ٹیڑھے ترچھوں کے بل اک آن میں جاتے ہیں نکل

پاک بازوں کو نہیں عہد میں میرے کھٹکا — جو کنونڈے میں وہی مجھ سے کھٹکتے ہیں سدا

سات پردوں میں اگر عیب کسی کا ہے چھپا — نہ ہوا آج تو کل ہوگا مقرر رسوا

ہیں خطا کار کے دشمن در و دیوار یہاں — بھائی بھائی کے نہیں ہوتے مددگار یہاں

اور اگر عیب سے ہے پاک کسی کا دامن — غم نہیں اُس کا ہو گر سارا زمانہ دشمن

نہ رعیت کا اُسے خوف نہ کچھ شاہ کا ڈر — نہ اُسے چور کا خطرہ نہ اُسے ساہ کا ڈر

نہ عدالت میں اُسے ڈر کسی فریادی کا — اور نہ کچھ دغدغہ اخباروں کی آزادی کا

جو ہنرمند ہیں دل اُن کے بڑھاتا ہیں ہوں — خوبیاں اُن کی زمانہ میں جتاتا ہیں ہوں

بے ہنر ہو کسی پیرایہ میں یہاں جلوہ نما — عہد میں میرے ہنرمند نہیں بن سکتا

یہاں نہ اُستاد کو شاگرد کی اصلاح سے عار — اور نہ شاگرد کو اپنی غلطی پر اصرار

سنتے جاہل سے ہیں گر فائدے کی بات حکیم — مستفیدوں کی طرح کرتے ہیں اُس کو تسلیم

ذکر آقا کی جتاتا ہے گر کوئی خطا — بن نہیں آتا کچھ آقا سے ندامت کے سوا

کر لئے پاتے نہیں گاہک یہ دُکاں دار ستم — جنس یاں تُل نہیں سکتی کبھی مقدار سے کم

بیل بے وجہ نہیں آرکسی کی کھاتا — شُدہ شُدہ گھوڑے پہ چابک نہیں اُٹھنے پاتا

اونچے اونچوں سے یہاں لیتے ہیں خدمت پوری — اور مزدوروں کو دیتے ہیں کھری مزدوری

نعمتیں جتنی ہیں یہاں خرم و دلشاد ہیں سب — خوار پھرتے ہیں وہی جو کہ ہیں آرام طلب

اہلِ مقدور کو کھٹکا نہیں کچھ چوروں سے — زورمند آنکھ مِلانے نہیں کمزوروں سے
خوب کو خوب سمجھتے نہیں یہاں زشت کو زشت — ناپ سے کم نہیں لگتی کہیں تعمیر میں خشت
جھوٹے سچوں کا نہیں بھیس بدلنے پاتے — دام بازار میں کھوٹے نہیں چلنے پاتے
جس طرف جائیے وہاں امن و اماں کا ہے عمل — فتنہ سرحد سے مِری جاتا ہے کترا کے نکل
جس قلمرو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں — ظلم کے ہاتھ میں وہاں حکم و عمل کی ہے عناں
دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب[1] وہاں — اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں
نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش — رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں وہاں خانہ بدوش
مان رکھا ہے جنھیں قوم نے اولادِ رسول — قوم کے ہاتھ سے ہوتے ہیں پیاسے مقتول
زکریا کی طرح جو ہیں خدا کے پیارے — اُن کے سر پر ہیں سدا ظلم کے چلتے آرے
زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں — اور یوسف سے برادر کو دغا دیتے ہیں

گفتگو ختم پہ انصاف کی جب آ پہنچی — عقل پیرِ کارِ قضا کار وہاں جا پہنچی
وہاں جو دیکھا تو ہے دو بھائیوں میں کچھ تکرار — اور ہر اک کو بزرگی پہ ہے اپنے اصرار
رحم اِدھر عدل سے کہتا ہے کہ تو ہے کیا چیز — اور اُدھر رحم کو ہے عدل سمجھتا ناچیز
عقل نے دونوں کی تقریر سُنی سرتاپا — کہہ چُکے وہ تو یہ سنجیدہ جواب اُن کو دیا
خیر اِک کان سے ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں — ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں
صاف کہتی ہوں سُن اے رحم نہیں اس میں خلاف — تو ہے اِک قالبِ بے روح نہ ہو گر انصاف

---

[1] صحیح لفظ معاتب ہے مگر اردو میں بجائے معاتب کے معتوب بولا جاتا ہے جیسے بجائے معفو کے معاف پس اردو میں یہی صحیح اور فصیح ہے۔

اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلف سر مو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تو

دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و شکیب
گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

سر سری فیصلہ تو یہ ہے اگر تم مانو
اور نہیں مانتے گر بات مری تم جانو

ابھی اک لحظہ میں تم دونوں کو جھٹلاتی ہوں
تو سنو غور سے میں کہتی ہوں اور جاتی ہوں

فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
جبکہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو

وہی اک شے ہے کہ ہے عدل کہیں نام اسکا
کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا

رحم کہلائے جو مظلوم کی فریاد سنے
عدل ٹھہرے جو سزا ظالم بے رحم کو دے

وہی شفقت ہے کہ استاد کی ہے مار کبھی
اور ماں باپ کی ہو جاتی ہے چمکار کبھی

وہی شفقت ہے کہ ہے گھور کہیں پیار کہیں
وہی جلوہ ہے کہ ہے نور کہیں نار کہیں

کہیں وہ مہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے
اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

کہیں وہ قند مکرر کا مزا دیتی ہے
اور کہیں چاشنیِ موت چکھا دیتی ہے

یہی شفقت تھی کہ جب اُس نے سمجھا یا انجام
شیخ فاروقؓ نے بیٹے کا کیا کام تمام

یہی شفقت تھی کہ جب ہو گیا بیجان پسر
ایک برچھی سی لگی باپ کے دل میں آکر

یہی شفقت ہے کہ زخمی کہیں کرواتی ہے
یہی شفقت ہے کہ پھر زخم کو بھرواتی ہے

رحم اور عدل سے جب عقل نے تقریر یہ کی
اور دی ساتھ ہی حالی نے شہادت اِسکی

رہی باقی نہ فریقین کو جائے انکار
چار و ناچار کیا ایک جہتی کا اقرار

بڑھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ گویا تھے ایک
مل کے ہو جائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

مسدس معروف بہ ننگِ خدمت

مرتبہ ۱۸۸۷ء

یاد ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں　　دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں
گلِ خود رو سے بسا تھا چمنِ کون و مکاں　　چار سو حسنِ خداداد کا سکہ تھا رواں
وضعِ عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خطِ قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفلِ معصوم کی مانند تھا یہ عالمِ پیر　　تھے ہم اک صنعتِ بیچون و چرا کی تصویر
ملکِ فطرت میں نہ تھی سلطنتِ نفسِ شریر　　طبع نے مملکتِ روح نہ کی تھی تسخیر
خوابِ غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

مال و دولت کی ہوس میں نہ گرفتار تھے ہم　　نہ بلندی کے نہ رفعت کے طلبگار تھے ہم
آپ ہی اپنے ہر اک رنج میں غمخوار تھے ہم　　مددِ غیر سے اصلا نہ خبردار تھے　　ہم
جو سبق آئے تھے اُستادِ ازل سے لے کر
وہی ہر منزل و ہر راہ میں تھا یہاں رہبر

اصل سے دور بہت ہونے نہ پائے تھے ابھی　　دیس سے چھوٹ کے پردیس میں آئے تھے ابھی

دن جدائی کے نصیبوں نے دکھائے تھے ابھی   ڈال سے توڑ کے بازار میں لائے تھے ابھی
عرصہ گزرا تھا مسافر کو نہ غربت میں بہت
جی لگا تھا نہ ابھی غیروں کی صحبت میں بہت

صاف آئینۂ دل میں نظر آتا تھا کوئی   روبرو جس کے جگہ دل میں نہ پاتا تھا کوئی
جی وہ جی تھا کہ نہ جس جی کو لبھاتا تھا کوئی   آنکھ وہ آنکھ تھی جس میں نہ سماتا تھا کوئی
روح تھی بادۂ دوشینہ سے اپنی بدمست
تھا ترقی پہ ابھی نشۂ صہبائے الست

اس قدر عمر دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم   عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
کسی محنت سے مشقت سے نہ معذور تھے ہم   آپ ہی راج تھے اور آپ ہی مزدور تھے ہم
تھے غلام آپ ہی اور آپ ہی آقا اپنے
خود ہی بیمار تھے اور خود ہی مسیحا اپنے

خودنمائی و خودآرائی کا کچھ دھیان نہ تھا   کبر و پندار کا جاری کہیں فرمان نہ تھا
گھر میں سامان نہ تھا در پہ نگہبان نہ تھا   جی میں فرعون زماں بننے کا ارمان نہ تھا
آکے دنیا میں بہت پاؤں نہ پھیلاتے تھے
اک مسافر کی طرح رہ کے چلے جاتے تھے

خاک کو نرم بچھونوں سے سوا جانتے تھے   روکھ کی چھاؤں کو ہم ظل ہما جانتے تھے
مل گیا جو اسے انعام خدا جانتے تھے   نہ برا جانتے تھے اور نہ بھلا جانتے تھے
طاعت نفس فرومایہ سے آزاد تھے ہم

ساگ اور پات پہ گزران تھی اور شاد تھے ہم

تھی سفر میں نہ سواری کی ضرورت زنہار — طے انھیں قدموں سے کرتے تھے ہر اک راہ گزار

کھانے پینے کو نہ تھے ظرف بلوریں در کار — انھیں ہاتوں پہ خور و نوش کا تھا اپنی مدار

شرم آتی تھی نہ ہل جوت کے کھانے سے ہمیں

عیب لگتا تھا نہ کچھ ڈھور چرانے سے ہمیں

تھک کے محنت سے جو ہم بھوک میں کھاتے تھے طعام — دیتے تھے کلّۂ بریاں کا مزا گندمِ خام

دست و بازو کی بدولت تھا ہمیں عیش مدام — خوب کٹتے تھے مشقت میں ہمارے ایّام

پیٹ کے مارے کہیں سر نہ جھکاتے ہم تھے

آبروئے نفس کی خاطر نہ گنواتے ہم تھے

کرنے پڑتے تھے ضیافت میں نہ بیجا ساماں — نان جو کھاتے تھے خوش ہو کے ہمارے مہماں

تھا بناوٹ کا پتہ اور نہ تکلف کا نشان — ایک قانوں کے پابند تھے دل اور زباں

طبل ظاہر کی نمائش کے نہ بجتے تھے وہاں

جو برستے تھے زیادہ نہ گرجتے تھے وہاں

آمدِ موسمِ گل میں تھا عجب لطف ہوا — آندھیوں نے کئے انجام کو طوفاں برپا

چشمہ نزدیک تھا منبع سے تو تھا عین صفا — جتنا بڑھتا گیا ہوتا گیا پانی گدلا

گھٹتے گھٹتے اثرِ صدق و صفا کچھ نہ رہا

آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

اے جہاں اے روشیں تازہ بدلنے والے — نت نئی چال نئی ڈھال سے چلنے والے

موم کی طرح ہر اک سانچہ میں ڈھلنے والے — روز اک سانگ نیا بھر کے نکلنے والے
آج کچھ اور ہے کل اور تھی کچھ شان تری
ایک سے ایک نہیں ملتی کہیں آن تری

اک زمانہ تھا کہ ہم وزن تھے سب خرد و کلاں — لہلہاتی تھی ہنی نوع کی کھیتی یکساں
ایک اسلوب پہ تھی گردش پرکار زماں — شہر و ویرانہ و آباد میں تھا ایک سماں
قدر و قیمت میں نہ تھا فرق کسی کی اصلا
کوئی پلہ تھا ترازو کا نہ اونچا نیچا

ایک سے ایک نہ کم تھا نہ زیادہ سرمو — سب تھے ہم ایک ترائی کے درخت خود رو
ما جبیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو — نہ زمیں بوس کی عادت تھی نہ تسلیم کی خو
دست قدرت کے سوا سر پہ کوئی ہاتھ نہ تھا
ایک قبلہ تھا کوئی قبلۂ حاجات نہ تھا

ناگہاں جور و تغلب کا اک اٹھا طوفاں — جس کے صدمہ سے ہوئی زیر و زبر نظم جہاں
اقویا ہاتھ ضعیفوں پہ لگے کرنے رواں — بکریوں کو نہ رہی بھیڑیوں سے جائے اماں
تیز دنداں ہوئے جنگل میں غزالوں پہ پلنگ
مچھلیوں پر لگے منہ کھولنے دریا میں نہنگ

حق نے شائستۂ ہر باب بنایا تھا ہمیں — ایک ہی دام میں پھنسنا نہ سکھایا تھا ہمیں
رستہ ہر کوچہ و منزل کا بتایا تھا ہمیں — زینہ ہر بام پہ چڑھنے کا دکھایا تھا ہمیں
ایسا کچھ بادۂ غفلت نے کیا متوالا
طوق خدمت کا لیا اور گلے میں ڈالا

درِ مخلوق کو ہم ملجا و ماویٰ سمجھے　　طاعتِ خلق کو اعزاز کا تمغہ سمجھے
پیشہ و حرفہ کو اجلاف کا شیوا سمجھے　　ننگِ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے

عیب گننے لگے نجاری و حدادی کو
سمجھے پھرنے لگے جوہر آزادی کو

نوکری ٹھہری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی　　پیشہ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی　　جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی

ہاتھ اپنے دلِ آزاد سے ہم دھو بیٹھے
ایک دولت تھی ہماری سو اسے کھو بیٹھے

کرتے ہیں قصدِ تجارت تو گرہ میں نہیں دام　　دست کاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام
نہیں ہل جوتنے میں راحت و آرام کا نام　　بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے اک اک کے غلام

نظر آتی نہیں مطلب کی کوئی گھات ہمیں
وہ پڑا نقش کہ ہر چال میں ہے مات ہمیں

ایک آقا ہو تو خدمت کا ہو حق اسکی ادا　　ایک افسر ہو تو حکم اس کا کوئی لائے بجا
زید کی رائے جدا عمرو کی تجویز جدا　　ایک بندہ کو بھگتنے کئی پڑتے ہیں خدا

بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اس کا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اس کا

کہیں بہتان کا اندیشہ کہیں بیم گناہ　　کہیں غماز کا دھڑکا کہیں خوفِ بدخواہ
جھیلنے روز وہ افسر کہ نہ ہو جن سے نباہ　　خدمت اک بارِ گراں ہے کہ معاذ اللہ

پڑے پتھر پہ تو پتھر میں گرانی نہ رہے
گزرے دریا پہ تو دریا میں روانی نہ رہے

آتی ہیں نوکروں کے سر پہ بلائیں اکثر بے سبب اُن پہ گزرتی ہیں جفائیں اکثر
ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر سامنے جاتے ہیں پڑھ پڑھ کے دعائیں اکثر
غیرت آئی جنھیں وہ ٹھہرنے پاتے نہیں یہاں
جو کہ عاقل ہیں کبھی کان ہلاتے نہیں یہاں

کیجیے فرض کہ ہے زید بڑا منصب دار اور عمرو اس کا ہے اک بندہ فرمانبردار
فرق دونوں میں نہیں اسکے سوا کچھ زنہار کہ یہ میلا ہے وہ اُجلا یہ پیادہ وہ سوار
ورنہ انصاف سے دیکھو تو ہیں نوکر دونوں
قید میں عجز میں ذلت میں برابر دونوں

عمرو کرتا ہے اگر اُس کا ادب اور تعظیم کرنی پڑتی ہے اُسے بھی کہیں جھک کر تسلیم
زید کی جھڑکیوں سے گر ہے دلِ عمرو دونیم جا کے سنتا ہے کہیں زید بھی الفاظِ سقیم
یا جی احمق اُسے کہنے کا اگر ہے دستور
ڈام فول اُس کو بھی سننا کہیں پڑتا ہے ضرور

رکھتے ہیں حضرتِ انساں جو بڑائی میں قدم گاو و خر اُن سے ہیں کیا جانیے کس بات میں کم
مالکوں کے اُنھیں گر جھیلنے پڑتے ہیں ستم ذلتیں اُن کے لئے بھی ہیں مہیا ہر دم
ننگِ خدمت کی حقیقت کو بشر گر سمجھے
چاکروں کو گدھے اور بیل سے بدتر سمجھے

کھیت سے اپنے بچھڑنے کا ہے گر اُنکو ملال　　مدّتیں گزریں کہ لوٹا گیا یہاں عیش و صال
نوکری نے جو ہیں دکھلایا طلسمِ اقبال　　چھوڑ کر شہر و وطن کو ہوئے جویائے محال

گھر چھٹا یار چھٹے خویش و یگانہ چھوٹا
ایک ذلّت ملی اور سارا زمانہ چھوٹا

اُن کی گردن میں اگر قید کی رسّی ہے پڑی　　اپنے بے بال و پری کی بھی کہانی ہے بڑی
تازہ حکموں کی لگی رہتی ہے ہر وقت جھڑی　　نہیں خالی کوئی ساعت کوئی پل کوئی گھڑی

مرغِ بے پر کی طرح قیدیِ صیّاد ہیں ہم
کہیے پھر کونسی حجّت سے کہ آزاد ہیں ہم

ہوتے ہیں فرطِ مشقّت سے اگر وہ رنجور　　مالک اُن کی نگرانی میں نہیں کرتے قصور
دیکھ لیتے نہیں جبتک کہ ہوئے روگ سے دور　　رکھتے ہیں محنت و تکلیف سے اُن کو معذور

جانتے ہیں یہی دھن ہے یہی دولت اپنی
دم سے وابستہ انھیں کے ہے معیشت اپنی

اپنی گر جان پہ بنجائے مشقّت سے یہاں　　نہیں اُمید کہ گزرے کسی خاطر پہ گراں
مطمئن ہیں کہ ہے مزدوروں کا دنیا میں سماں　　نہ ہوا ایک تو رکتی نہیں تعمیرِ مکاں

پھرتے ہیں پیٹ کی یہاں دیتے دہائی لاکھوں
گر نہیں آپ تو ہیں آپ کے بھائی لاکھوں

حق کسی کا نہیں ماتحت ہو یا ہو افسر　　ایک سے کام لیا ایک کو سونپا دفتر
یہی گھر بدلیاں رہتی ہیں یہاں شام و سحر　　فی المثل ایک کرایہ کی دُکاں ہے نوکر

رہے جب تک کسی بنیاد میں آیا نہ خلل
لگی جب بیٹھنے لی جا کے کہیں اور بدل

نوکروں سے ہیں بہائم کہیں رتبہ میں سوا — کہ نہیں خدمت ہمجنس کا اُن پر دھبا
گائے ہو بیل ہو گھوڑا ہو کہ ہو اس میں گدھا — ایک کو ایک کا تابع کہیں دیکھا نہ سُنا
کسی مخلوق کو رتبہ نہ خدا نے بخشا
جو غلاموں کو شرف عقل رسا نے بخشا

اس سے بڑھ کر نہیں ذلت کا کوئی نشاں یہاں — کہ ہو ہمجنس کی ہمجنس کے قبضے میں عناں
ایک گلے میں کوئی بھیڑ ہو اور کوئی شبان — نسل آدم میں کوئی ڈھور ہو کوئی انسان
ناتواں ٹھہرے کوئی کوئی تنومند بنے
ایک نوکر بنے اور ایک خداوند بنے

ایک ہی تخم سے پیلو بھی ہو شمشاد بھی ہو — ایک ہی اصل سے خسرو بھی ہو فرہاد بھی ہو
ایک ہی ڈار میں آہو بھی ہو صیاد بھی ہو — ایک ہی نسل سے بندہ بھی ہو آزاد بھی ہو
ایک ہی سبزہ کہ جو تازہ بھی ہو خشک بھی ہو
ایک ہی قطرہ کہ خوں رحم بھی ہو مشک بھی ہو

ایک وہ ہیں کہ نہیں غیر کے فرمانبردار — اپنی ہر بات کے ہر کام کے خود ہیں مختار
نہیں سرکار سے دربار سے اُن کو سروکار — جس جگہ بیٹھ گئے ہے وہی اُن کا دربار
گر تونگر ہیں تو دس پانچ ہیں اُن کے محکوم
ورنہ خادم ہیں کسی کے نہ کسی کے مخدوم

حکم سے کوئی نہیں اُن کا بُلانے والا　　جبر سے کوئی نہیں اُن کا دبا لینے والا
بیٹھ جائیں تو نہیں کوئی اُٹھانے والا　　سو رہیں جب تو نہیں کوئی جگانے والا
اُٹھ کے چل دیں تو نہیں روکنے والا کوئی
اُلٹے پھر جائیں جو ہو ٹوکنے والا کوئی

ایک وہ ہیں کہ زمانہ کرے انصاف اگر　　اور کھل جائیں کمالات بھی اُنکے سب پر
جوہری جو ہیں وہ سب اُنکے پرکھ لیں جوہر　　کامیابی نہیں اُن کے لئے اس سے بڑھ کر
کہ سدا قید رہیں مُرغِ خوش الحاں کی طرح
جا کے بک جائیں کہیں یوسفِ کنعاں کی طرح

دیکھ لیں جب اُنھیں ہر علم و ہنر میں یکتا　　شرفِ ذات میں اور اصل و گہر میں یکتا
زور بازو میں بلندیِ نظر میں یکتا　　الغرض جملہ کمالاتِ بشر میں یکتا
اور پھر اُس پہ مدد طالعِ بیدار کی ہو
تب نصیب اُن کو غلامی کسی سرکار کی ہو

ورنہ دن رات پھریں ٹھوکریں کھاتے دَر دَر　　سندیں چِٹھیاں پروانے دکھاتے دَر دَر
جا بجا پوچھی سے دل ایک اک کا اُٹھاتے دَر دَر　　ذلّتہ نفس کو ذلّت کا چکھاتے دَر دَر
تا کہ ذلّت سے بسر کرنے کی عادت ہو جائے
نفس جس طرح بنے لائقِ خدمت ہو جائے

کوئی دفتر نہیں اور کوئی کچہری ایسی　　کہ جہاں گزری ہو ایک آدھ نہ عرضی اُنکی
سینکڑے مشرقی یاں ہیں اگر کوئی اسامی خالی　　قافلے ہوتے ہیں مغرب سے اُسی دم راہی

برسوں اس پر بھی گزر جاتے ہیں بے نیل و مرام
کوئی آقا نہیں ملتا کہ بنیں اُس کے غلام

تنگ ہوتے ہیں تو تقدیر کا کرتے ہیں گلا — کبھی ٹھہراتے ہیں گردش کو زمانہ کی بُرا
کبھی سرکار کو کہتے ہیں کہ ہے بے پروا — کبھی فرماتے ہیں یہ ہو کے مشیت سے خفا

وعدۂ رزق میں سنتے تھے کہ ہوتی نہیں دیر
پھر جو نوکر نہیں ہوتے تو یہ ہے کیا اندھیر

جانتے ہیں کہ ہے جس رزق کا ہم سے وعدہ — اُس کا حیلہ نہیں یہاں کوئی غلامی کے سوا
اور دروازے ہوئے بند سب اُن پر گویا — اب فلک پر اُنھیں ملجا نہ زمیں پر ماوی

کام ہوتا کوئی اور اُن سے سرانجام نہیں
جس طرح بیل کو جُتنے کے سوا کام نہیں

جن کے اسلاف نے تھا قوم کا دیکھا اقبال — یاد کرتے ہیں جب اسلاف کا وہ جاہ و جلال
پاتے ہیں اُن کو عنایات سے شاہوں کی نہال — مال و دولت سے انھیں دیکھتے ہیں مالامال

ایک کی ایک سے پاتے ہیں فزوں تر توقیر
کوئی بخشی کوئی دیوان کوئی صدر کبیر

دیکھتے جب ہیں کہ دم ساز تھے اُن سے ایام — بادۂ عیش سے لبریز تھا جام اُن کا مدام
کہتے ہیں خدمت سلطاں میں ہے اعزاز تمام — اس لئے ہم نے لیا پیشۂ آبائے کرام

دیکھیں منہ ڈال کے گر اپنے گریبان میں وہ
عمر برباد کریں پھر نہ اس ارمان میں وہ

ہنس کی چال حماقت سے چلا جو کوّا　　اپنی بھی چال گیا بھول بقول حکما
پیروی کرتے ہیں اسلاف کی اب جو حمقا　　وہ نہیں جانتے رنگ آج زمانہ کا ہے کیا

اپنا کیا حال ہے اسلاف کی حالت کیا تھی
اپنی توقیر ہے کیا اُن کی وجاہت کیا تھی

سلطنت کے وہی اعضا تھے وہی تھے ارکان　　اُن سے ہر حال میں دربار کو تھا اطمینان
رتق او فتق کی ہاتھوں میں اُنھیں کے تھی عنان　　طبل و نقارہ انھیں کا تھا انھیں کا تھا نشان

تھے وہی قائد لشکر وہی دفتر کے دبیر
تھے وہی شرع کے مفتی وہی دولت کے مشیر

مشورت اُن سے ہر اک بات میں لیجاتی تھی　　جستجو اُن کی مُہمات میں کی جاتی تھی
رُخصتِ خلوت و جُلوت اُنھیں دیجاتی تھی　　سب چھپی اور ڈھکی اُن سے کہی جاتی تھی

ڈھونڈ ڈھونڈ اُن کو بلاتے تھے حکومت کے لئے
خدمت اُن کے لئے تھی اور وہ خدمت کے لئے

اُن کی نسلوں کی بھی کیا آج یہی ہے توقیر　　نوکری کے لئے پھرتے ہیں جو کرتے تدبیر
کاش سوچے انھیں ع بیٹھ رہے ہیں وہ لکیر　　کاش سمجھیں کہ ہیں کس وہم کے پھندے میں اسیر

بھاگوان آیا تھا جو قوم پہ وہ سال گیا
گئے منصب بھی جہاں قوم کا اقبال گیا

اب حسب اور نسب پر نہیں نازش کا محل　　گردشِ دہر نے دی صورت احوال بدل
خاندانوں کی نجیبوں کے گئی ٹھیک نکل　　کسی قابل نہ رہے شیخ نہ سیّد نہ مغل

گر گئے جو مے پندار کے تھے متوالے
بڑھ گئے پیشہ و مزدوری و محنت والے

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں   چاہیئے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں
ہو میسر جنھیں وہ خدمت سرکار کریں   ورنہ مزدوری و محنت سر بازار کریں
آبرو اس میں ہے شان اس میں ہے عزت اس میں
فخر اس میں ہے شرف اس میں شرافت اس میں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں   کشتکاری کریں آئین فلاحت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاحت سیکھیں   الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

بیٹا عمران کا وہ فخر بنی اسرائیل   ہم سخن جس سے ہوا طور پہ خود رب جلیل
جس نے فرعون کے لشکر کو کیا خوار و ذلیل   جس کے خود دست و عصا میں تھی رسالت کی دلیل
گلہ بانی کے لئے پایا جو ایمائے شعیب
بکریاں آپ نے چرانے میں نہ سمجھا کچھ عیب

انبیا پیشہ سے گزران سدا کرتے رہے   اولیا خلق کی طاعت سے ابا کرتے رہے
خدمت خلق سے نفرت حکما کرتے رہے   حاجتیں آپ ہی سب اپنی روا کرتے رہے
اپنے ہاتھوں سے ہر اک کام نبیڑا اپنا
کھینچ کر لے گئے خود موج سے بیڑا اپنا

کی ہے مردوں نے اسی طرح سے دنیا میں گزر — ہوئی تکلیف سے یا چین سے اوقات بسر
نہ ہوئے غیر کے تا زیست کبھی دست نگر — جب پڑی اپنے ہی بازو پہ پڑی جا کے نظر
گئے دل جمع یہاں سے کہ پریشان گئے
پر نہ مانے کے نہ شرمندۂ احسان گئے

ہو گئے حالی سے نہ دنیا میں کہیں ہرزہ سرا — خود ہیں گمراہ مگر قوم کے ہیں راہ نما
جھکتے جھکتے ہوئی پشت آپکی خدمت میں دوتا — اس پہ ہے خیر سے آزادہ روی کا دعویٰ
بات کہنی وہی زیبا ہے کہ ہو جس میں اثر
ورنہ بے حرف نصیحت سے خموشی بہتر

تہنیت جلسۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ

مرقومہ ۱۸۸۱ء

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سر راہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں — راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے — روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے — ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

ہم نے اُن عالی بناؤں سے کیا آشکار | آشکارا جن سے اُن کے بانیوں کا ہے جلال
شان و شوکت کی تمہاری دھوم ہے آفاق میں | دور سے آ آکے تم کو دیکھتے ہیں باکمال
قوم کو اُس شان و شوکت سے تمہاری کیا ملا | دو جواب اس کا اگر رکھتے ہو یارائے مقال
سرنگوں ہو کر وہ سب بولیں زبانِ حال سے | ہو سکا ہم سے نہ کچھ۔ الانفعال الانفعال

بانیوں نے تھا بنایا اِس لئے گویا ہمیں
ہم کو جب دیکھیں خلفِ اسلاف کو رویا کریں

شوق سے اُس نے بنایا مقبرہ اک شاندار | اور چھوڑا اُس نے اک ایوانِ عالی یادگار
ایک نے دنیا کے پودے باغ میں اپنے لگائے | ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بیشمار
ایک محبِّ قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے | قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار
ہو گی عالم میں کبھو سرسبز یہ پھلی مراد | یا وہ اگلوں کی اُمیدیں لائینگی کچھ برگ و بار

چشمہ سرجیون ہے جو بہتا رہیگا یہاں وہی
سب اُتر جائینگی چڑھ چڑھ ندیاں برسات کی

دور سے اُمید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے | ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے
قوم کے پیر و جواں سب ہو گئے تھے مُردہ دل | دردمندی جوش میں پیدا اہلِ دل کو لائی ہے
پاؤ گے تاریخ میں ہرگز نہ تم اسکی مثال | سلطنت نے قوم کی جو یہاں مدد فرمائی ہے
غیر قوموں نے بھی کی ہے شرطِ ہمدردی ادا | یہ بنا چلتی ہوا آنک کو بھی دل سے بھائی ہے

آؤ ہم بھی اسے عزیز و مغتنم سمجھیں اِسے
اک ضروری کام اپنا کم سے کم سمجھیں اِسے

یہ مبارک گھر نزولِ خیر و برکت ہے جہاں   جس کی پیشانی سے ظاہر ہیں سعادت کے نشاں
یہ نہالِ تازہ جس کو اک زمین شور میں   خرّم و سرسبز کرنا چاہتے ہیں باغباں
یہ مسیحائی علاج اُس دردِ بے درماں کا ہے   لا دوا ٹھہرا چکے جس کو اطبّائے زماں
یہ نمونہ اُس عزیزِ مصر کا جس نے ستم   جن کے ہاتھوں سے سہے دی قحط سے اُن کو اماں

عہد و پیماں اے عزیزو تم سے کچھ کرنے کو ہے
قوم کو پھر برکتیں بے انتہا دینے کو ہے

آ رہی ہے اُس مکاں کے گوشہ گوشہ سے صدا   قوم اگر سمجھے تو ہوں میں قوم کا حاجت روا
ہے کوئی اکسیر دُنیا میں تو ہوں اکسیر میں   اور اصل کیمیا کچھ ہے تو میں ہوں کیمیا
ہات آ جاتا سکندر کو اگر میرا سُراغ   چھوڑ دیتا جستجوئے چشمۂ آبِ بقا
میرے جو حامی ہیں اُنکی یوں پھلینگی کوششیں   ایک دانے سے ہوں خوشے جس طرح بے انتہا

ہے عبث گر قوم نے بے وقت پہچانا مجھے
برکتیں اُن پر جنھوں نے وقت پر جانا مجھے

اُن سے کہدو قوم میں ہیں جو کہ عالی خانداں   یا جنھیں جاگیر و منصب پر ہے نازِ بیکراں
کیا لئے بیٹھے ہو فخرِ منصب و جاگیر کو   منصب و جاگیر ہیں سب کوئی دن کے میہماں
تم نہیں رتبہ میں بڑھکر تغلق و تیمور سے   تنگ ہیں آج اُنکی نسلوں پر زمین و آسماں
چھوڑ جاؤ واسطے اولاد کے کوئی سپر   ورنہ وارا پنا کرے گی گردشِ دورِ زماں

آؤ باندھو عہد مجھ سے اور میرا ساتھ دو
میرا سودا نقد ہے اِس ہات دو اُس ہات لو

میں تمھیں پستی سے پہنچاؤنگا تا اوجِ کمال — میں تمھیں دیکھونگا جب گرتا ہوا لونگا سنبھال
میں بناؤنگا تمھارے کام سب بگڑے ہوئے — میں سکھاؤنگا زمانہ کی تمھیں سب چال ڈھال
جو کرینگے آج میری دست و بازو سے مدد — میں سدا کرتا رہونگا اُن کی نسلوں کو نہال
قوم کا حامی ہوں اور اسلام کا یاور ہوں میں — چاہو دار الکفر سمجھو مجھ کو یا دار الضلال

میں دکھا دونگا کہ جو دشمن تھے میرے نام کے
تھے حقیقت میں وہ دشمن قوم اور اسلام کے

ملک میں عزت سے رہنا میں سکھاؤنگا تمھیں — سلطنت کا معتمد بننا بتاؤں گا تمھیں
قابلیت تم میں بڑھنے کی ہے دیکھوں کسقدر — بڑھ سکوگے جسقدر اُتنا بڑھاؤں گا تمھیں
تب یہ سمجھوگے کہ ہم سوتے تھے کب کے بیخبر — دفعتاً جب خوابِ غفلت سے جگاؤں گا تمھیں
یاد ہوگا تم کو وہ کھویا ہوا اپنا خطاب — پھر مخاطب "خیرِ اُمّۃ" کا بناؤں گا تمھیں

مجھ کو دیکھو گر مرے دعووں میں ہو کچھ اشتباہ
روزِ روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

بارک اللہ اے ریاضِ علم اے عین الحیات — ہے ہمائے بخت و دولت کی عناں اب تیرے ہات
ہو اُجالا اب روشنی تیری دلیلِ کارواں — چار سو کالی گھٹا چھائی ہے اور کالی ہے رات
تو ہم سے تو کبھی یوں جہل اور تعصب کو مٹا — جس طرح دینِ حنیفی سے مٹے لات و منات
چھوڑ جائیں گے جہاں میں جو کہ تجھ جیسے نشاں — چھوڑ جائینگے وہی کچھ باقیات الصالحات

ایک باہمت جماعت جب سے تیرے ساتھ ہے
ہم سمجھتے ہیں ترے سر پر خدا کا ہات ہے

تو سدا آباد رہ اے قوم کی امید گاہ — اے یگانوں اور بیگانوں کے یکساں خیر خواہ
دیکھتے ہیں غیر حیرت اور تعجب سے تجھے — قوم نے اب بھی اگر سمجھا نہ تجھ کو آہ آہ !
اپنے حامی آپ پیدا کر کہ کوہ سر بلند — اپنی پونجی سے ہے آپ اپنے لئے پشت پناہ
خیر کی امید رکھنی ہے عبث اس قوم سے — آپ کو جس نے کیا ہو اپنے ہاتھوں سے تباہ

چارہ آخر کچھ نہیں حالیؔ بجز صبر و سکون
کر دعا اب اِھْدِ قَوْمِیْ اِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْن

تعصب و انصاف

مرتبہ ۱۸۸۳ء

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا — جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا
اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی — اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی
اپنی ہر آن پہ ہم مرتے تھے — اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے
اپنے انداز کے سودائی تھے — اپنے جلوے کے تماشائی تھے
کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ — سر دھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ
آپ خوبی پہ تھے اپنی مفتوں — خود ہی لیلیٰ تھے ہم اور خود مجنوں
جس جزیرہ میں ہوئے تھے پیدا — اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا
روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی — آگہی طوس نہ بسطام کی تھی

تھے تماشائیِ دشتِ پُرخار — کبھی گلشن کی نہ دیکھی تھی بہار
پی کے شورآب ہی ہوتے تھے بحال — کہ نہ چکھا تھا کبھی آبِ زلال
نالۂ زاغ و زغن پر تھے فدا — نہ سُنی تھی کبھی بلبل کی صدا
سیر و انگوزہ کی بو پر تھے نثار — کہ نہ برتا تھا کبھی مشکِ تتار
پرنیاں جانتے تھے کمبل کو — کہ نہ برتا تھا کبھی مخمل کو
اوپری تھی نہ سُنی بات کبھی — بدلے دیکھے تھے نہ دن رات کبھی
ہم بسر کرتے تھے جس عالم میں — واں سماں ایک تھا ہر موسم میں
رُخ ہوا کا نہ بدلتا تھا کبھی — موسم آکر نہ نکلتا تھا کبھی
ایک ہی فصل پہ تھا دار و مدار — واں خزاں جاکے نہ آتی تھی بہار
ایک سے رہتے تھے دن رات سدا — آسماں کو تھی نہ گردش اصلا
تھی سمجھ پیر و جواں کی یکساں — عقل تھی خُرد و کلاں کی یکساں
رکھتے تھے ایک سبق از بر یاد — مبتدی منتہی شاگرد اُستاد
واں نہ تھی حدِّ بلوغِ صبیاں — پیر بالغ تھے نہ بالغ تھے جواں
نئی بولی کا وہاں حرف نہ تھا — تیس حرفوں کے سوا حرف نہ تھا
تھے خدا کے وہی ننانوے نام — اور لینا تھا وہاں نام حرام
اہلِ دولت کی نہ تھی عام عطا — ایک ہی سمت برستی تھی گھٹا
تھا نہ دیداروں کو غیروں سے لگاؤ — ایک ہی سمت تھا رحمت کا جھکاؤ
دعوے غیروں کے تھے سب بے صرفہ — فیصلے ہوتے تھے نت یک طرفہ

راستی کا تھا نہ غیروں پہ گماں — حق نہ دائر تھا فریقین میں وہاں

تھا عناصر میں نہ وہاں آگ نہ باد — خلق سے ایک ہوئی مٹی تھی مراد

حس و حرکت کے کوئی پاس نہ تھا — واں کا حیوان بھی حساس نہ تھا

تھی درختوں کو نہ وہاں نشو و نما — چلنے پاتی تھی نہ گلشن میں ہوا

گل شگفتہ تھے نہ پودے شاداب — واں زمانہ پہ نہ آیا تھا شباب

وہی مرغوب تھی واں پوشش تن — جس سے آدم نے چھپایا تھا بدن

تھے پسندیدہ اُسی شان کے گھر — کی تھی حوا نے جہاں عمر بسر

اُسی انداز کے چلتے تھے جہاز — کشتیِ نوح کا جو تھا انداز

تھی اُسی نسخہ پہ موقوف شفا — جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی تھی نہ وہاں راہ قدیم — تھا اسے لکھ گئے جو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلا — وہاں نہ پانی تھا مرکب نہ ہوا

گھوڑے دوڑائے تھے اگلوں نے جہاں — وہی جولانگہ مردم تھی وہاں

کی تھی جس جا قدما نے منزل — بڑھنے پاتے تھے نہ وہاں سے محمل

علم و فن تھے نئے سارے مردود — غیب کے وہاں تھے خزانے محدود

نئی لذت سے تھی ہر طبع نفور — نعمتیں حق کی وہاں تھی محصور

سب کی گدی پہ لگی تھیں آنکھیں — کچھ نہ آگے نظر آتا تھا انھیں

پیچھے گر دیکھتے تھے ریگستاں — سوجھتا تھا انھیں وہ آب رواں

آگے ہوتا تھا اگر چشمہ آب — وہ سراسر نظر آتا تھا سراب

روشنی رکھتی تھی اُن سے آن بن — جیسے خفاش سے سورج کی کرن
تھا لکیر اپنی پہ ایک ایک فقیر — دل پہ ہر نقش تھا پتھر کی لکیر
رسم و عادت نہ بدلتی تھی وہاں — برف جم کر نہ پگھلتی تھی وہاں
آگ وہاں بجھ کے سُلگتی کم تھی — اور سُلگتی تھی تو لگتی کم تھی
شان میں وہاں نہ سُنا تھا حق کی — کل یوم ہو فی شان کبھی
وضع میں تھا نہ تغیر خو میں — جائے دل سنگ تھا ہر پہلو میں
سمجھا جاتا وہ دل بے فرماں — مہر جس دل پہ نہ ہوتی تھی وہاں
بات مشکل تھی دلوں سے جانی — نقش تھے دل کے خط پیشانی
غیر کی بات خطا اپنی صواب — سب سوالوں کا تھا وہاں ایک جواب
چڑھ کے گر بحث کو جاتے تھے کہیں — فتح کا پہلے سے ہوتا تھا یقیں
تھی وہاں حق کی یہی ڈفینیشن — منہ سے جو اپنے نکل جائے سخن
اُسی عالم میں پلے تھے ہم بھی — اُسی ساون کے تھے اندھے ہم بھی

جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پر — ختم ہیں سارے کمالاتِ بشر
حق نے جو ہم پہ کیے ہیں احساں — اُن سے محروم ہے نوعِ انساں
سب سے ہر بات میں، ہم ہیں افضل — اب نہیں کوئی ترقی کا محل
اپنے حصہ میں ہے ساری تہذیب — خانہ پرور ہے ہماری تہذیب
جو قدیم اپنا چلن ہے اور چال — خُردہ گیری کی نہیں اُس میں مجال

ہے بری عیب سے خوراک اپنی　　پاک دھبے سے ہے پوشاک اپنی
رسم اپنی نہیں بیجا کوئی　　طور اپنا نہیں بھونڈا کوئی
آدمیت کے ہمیں ہیں مصداق　　ہم سے سیکھے کوئی حسنِ اخلاق
سب سے عالی ہیں خیالات اپنے　　سب مسلّم ہیں کمالات اپنے
ہم چلے جاتے ہیں جس رستے پر　　واں نہ کھٹکا ہے کہیں کا نہ خطر
تھے سمائے ہوئے جو دل میں خیال　　تھا تصوّر بھی خلاف اُن کے محال
جس کو اک بار بُرا جان لیا　　عمر بھر پھر اُسے اچھا نہ کہا
ٹوٹتی تھی نہ کبھی اپنی دلیل　　وہی دعویٰ تھا وہی اپنی دلیل
وہم و شک کی کوئی صورت ہی نہ تھی　　ہم کو تحقیق کی حاجت ہی نہ تھی
جو بدلتی تھی نہ بدلی تھی کبھی　　رائے ایسی تھی پسند ایسی تھی
ہم سمجھتے تھے نہ سمجھانے سے　　اور اُلجھ جاتے تھے سُلجھانے سے
سچ وہی تھا جسے سچ جان لیا　　جھوٹ تھا جھوٹ جسے مان لیا
حق و باطل کی یہی تھی میزان　　جھوٹ اور سچ کی یہی تھی پہچان
ذات باری کو نہیں جیسے زوال　　رائے اپنی بھی بدلنی تھی محال
کوہ ہٹ جائے تو یہ تھا ممکن　　ہم نہ ہٹتے تھے جگہ سے لیکن
حُسن ظن تھا یہ سمجھ پر اپنی　　غلطی کا تھا گماں تک نہ کبھی
تھے لڑکپن کے خیالات تمام　　دل میں اُترے ہوئے شکل الہام
دیکھتے سنتے تھے جو اُس کے خلاف　　نظر آتا تھا وہ سب لاف و گزاف

تھی نئی بات سے یہاں تک نفرت — ہوتی تھی سُننے سے پہلے وحشت

بو نئی شے کی جو پا لیتے تھے — ناک بِن دیکھے چڑھا لیتے تھے

عقل کی تھیں نہ صلاحیں مقبول — تھی وہ سرکار میں اپنی معزول

فکر پر زور نہ ڈالا تھا کبھی — ہوش سا ہم نے نہ سنبھالا تھا کبھی

جو کہ تھا اپنی کتابوں میں لکھا — کوئی حرف اُس میں بجز الہام نہ تھا

جو کہانی تھی بزرگوں نے کہی — تھا وہی فلسفہ اور علم وہی

تھا لباسوں میں لباس اپنا لباس — اور سب سوختنی بے وسواس

تھی زباں اپنی زبانِ پاکاں — ماسوا اہلِ جہنم کی زباں

جلوۂ دہر کا باقی تھا نہ ہوش — تھے نشے میں یہ خودی کے مدہوش

کان میں پڑتی تھی جب بات نئی — غیر ہو جاتی تھی حالت دل کی

خرق عادت بھی اگر دیکھتے تھے — آنکھ اُٹھا کر نہ اُدھر دیکھتے تھے

نئی آواز سے چونک اُٹھتے تھے — اور ہر شکل پہ بھونک اُٹھتے تھے

ساری دنیا سے نرالا تھا مذاق — ہم کو تھا زہر بھی اپنا تریاق

اپنی حجت کو قوی جانتے تھے — بات ہر پھیر کے وہی مانتے تھے

تھا نہ قصدِ حق و باطل مطلق — جو پڑھا تھا وہی ازبر تھا سبق

خصم سے بحث اگر کرتے تھے — حق سے ہم قطع نظر کرتے تھے

کاٹ دی خصم نے جو بات کہی — بحث و تکرار کی غایت تھی یہی

خصم کی بات کو کرنا تسلیم — اپنے نزدیک ہزیمت تھی عظیم

حق کا خطرہ جو کبھی آتا تھا　　نفس آپ اپنے کو جھٹلاتا تھا
دشمنی کے یہی معنی تھے کہ جو　　ہم کہیں بات وہ تسلیم نہ ہو
ہم اندھیرے کو اگر کہتے تھے نور　　دوستوں کو بھی کہنا تھا ضرور
گر خلاف اپنے کوئی بول اُٹھا　　اُس سے بڑھ کر کوئی بدخواہ نہ تھا
ذکر غیروں کا نہ تھا بے نفریں　　کوئی مردود تھا اور کوئی لعیں
غیر کے واسطے تھی نارِ سعیر　　باغِ فردوس تھی اپنی جاگیر
اور تھے حرص و ہوا کے بندے　　ہم تھے مخصوص خدا کے بندے
بخششیں ختم تھیں ساری ہم پر　　وقف تھی رحمتِ باری ہم پر
نیک اعمال تھے غیروں کے تباہ　　اور مغفور تھے سب اپنے گناہ
عین تحقیق تھی اپنی تقلید　　شرک اپنا تھا سراسر توحید
تھا بدی کا نہ گنہ کا کچھ ڈر　　پاس ایسی کوئی رکھتے تھے سپر
سب دعاگو تھے ہمارے ملکوت　　تھے ہمیں آدم و حوا کے سپوت
حوضِ کوثر پہ تھا قبضہ اپنا　　سلسبیل اپنی تھی طوبیٰ اپنا
اپنی ظلمت تھی سراسر تنویر　　اپنے اندھوں کو بھی کہتے تھے بصیر
رکھتے جنت میں نہ تھے ہم ساجھی　　غیر ناری تھے سب اور ہم ناجی
تھے قضا اور قدر کے مالک　　ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک

عصبیت میں رہے جب تک چور　　کھنچتے یوں ہی رہے آپ کو دور

نظر آتا تھا نہ کچھ پست و بلند — تھے ہم ایک کلبۂ تاریک میں بند
دی جب انصاف نے دستک آکر — حجرۂ تنگ سے نکلے باہر
جلوۂ علم و یقیں کو دیکھا — آسمان اور زمیں کو دیکھا
رُخ حقیقت نے دکھایا ہر سو — چاندنا سا نظر آیا ہر سو
کی تعصب سے جو ہیں قطع نظر — ہوا ایک اور ہی عالم میں گزر
علم پر تھا نہ جہاں کوئی حجاب — وضو کا پانی کا نہ دیتا تھا سراب
جھوٹ سے سچ نظر آتا تھا الگ — دودھ پانی نظر آتا تھا الگ
نکتہ چیں یار نہ تھے واں یاروں کے — قدرداں ہنر تھے اغیاروں کے
دُور بیگانہ نہ تھا خویش سے وہاں — خویش اوّل تھا نہ درویش سے واں
عیب سب کہتے تھے اپنے خوش خوش — دورغ وہاں اپنی بھی ہوتی تھی ترش
تھی نجس کوئی نہ انساں کی زباں — گاڈ بھی کہتے تھے اللہ کو وہاں
حق کی پہچان جُز اخلاص نہ تھی — حق کی پرستش کوئی وہاں خاص نہ تھی
ساتھ اغیار کے کھاتے تھے اگر — کبھی ایماں کا نہ ہوتا تھا ضرر
صلحا لیمپ جلاتے تھے وہاں — اتقیا میز پہ کھاتے تھے وہاں
نہ سمجھتا تھا وہاں کوئی بشر — آپ کو نوع بشر سے بہتر
بھائی انساں تھے سب انسانوں کے — تھے ہنود و مسلمانوں کے
ایک معدن کے تھے سب لعل و گہر — ایک ڈالی کے تھے سب برگ و ثمر
اشعری۔ معتزلی۔ لا مذہب — ایک ماں باپ کی اولاد تھے سب

اپنی ہر رائے پہ کرنا اصرار　　کفر وہاں بس یہی پایا تھا قرار
ہٹ سے باز آتے نہ تھے جو زنہار　　تھے وہ بوجہل کی اُمت میں شمار
پاؤں وہاں جن کے پھسل جاتے تھے　　خود پھسل کر وہ سنبھل جاتے تھے
ٹیڑھ وہاں دل کی نکل سکتی تھی　　رائے اپنی بھی بدل سکتی تھی
دیکھ حجت کو قوی پیر و جواں　　بند ہو جاتے تھے حجتوں سے وہاں
حق کی آواز جہاں آتی تھی　　مت کروڑوں کی بدل جاتی تھی
پاک عقلیں تھیں خطا سے نہ علوم　　جز نبی کوئی نہ تھا وہاں معصوم
غور ہر بات میں کی جاتی تھی　　مشورت عقل سے لی جاتی تھی
تھی وہاں عقل معطل نہ حواس　　سب قویٰ کام میں تھے بے وسواس
آنکھ رہ سکتی نہ تھی بن دیکھے　　کان سننے سے نہ باز آتے تھے
سوجھتی تھی جو انوکھی کوئی چیز　　جانچتی تھی اُسے وہاں چشم تمیز
سنتے تھے بات نرالی جس دم　　کستے تھے اُس کو محک پر باہم
کڑوے اور میٹھے کو چکھ لیتے تھے　　کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے تھے
پھول ہر خار سے چن لیتے تھے　　بھوگ بچوں کے بھی سن لیتے تھے
عادتیں سب کی بدلتی تھیں سدا　　ایک اللہ کی عادت کے سوا
عیب جس رسم میں پا لیتے تھے　　دل وہیں اُس سے ہٹا لیتے تھے
اُجلی پوشاک جو مل جاتی تھی　　مل گئے کپڑوں سے شرم آتی تھی
دیکھ لی جس نے کہ شمع کافور　　تھا وہ چیکٹ بھرے ڈیوٹ سے نفور

ہاتھ آجاتا تھا جب مال نسیا
پھینک سب دیتے تھے عطار دوا

گر کے ہوجاتے تھے گھر جن کے کھنڈر
گھر کی واجب تھی مرمت اُن پر

نت نئی ریت نکلتی تھی وہاں
رُت سماں روز بدلتی تھی وہاں

قافلے چلتے تھے دن رات تمام
کبھی منزل پہ نہ کرتے تھے مقام

قبلہ تھا علم الٰہی اُن کا
تھا سفر نامتناہی اُن کا

تشنۂ علم تھے واں سب ایسے
پیاسے پانی کے ہوں طالب جیسے

نہ مجسطی پہ قناعت تھی اُنھیں
نہ اشارات کفایت تھی اُنھیں

عرش تحقیق تھا آستھان اُن کا
مصر تیرتھ تھا نہ یونان اُن کا

دیکھا جب عالمِ انصاف کا رنگ
ہم کو خود آنے لگا آپ سے ننگ

خوبیاں اپنی تھیں جو ذہن نشیں
اُن پہ ہم کرنے لگے خود نفریں

عیب سب اپنے نظر آنے لگے
آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے

ہوئی وہ بزمِ خیالی برہم
تھا طلسمات کا گویا عالم

جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا
اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا

تھا کیا جس کو یقیں چشمۂ آب
وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب

قصر و ایواں کا گماں تھا جن پر
نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر

تھا سبک دانۂ خردل سے سوا
کوہ الوند جسے سمجھا تھا

جب ہر اک قوم کا ساماں دیکھا
ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا

نکلے سب ہیچ خیالات اپنے
ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے

آپ کو اونٹ سمجھتا تھا بڑا
نکلا جب تک کسی گھاٹی سے نہ تھا

چوٹیاں آئیں جو پربت کی نظر — پھر اُٹھایا نہ کبھی اونٹ نے سر
جھنڈگا جب تک رہا گولر میں نہاں — تھا وہی اُس کے تصوّر میں جہاں
پر وہ گولر سے جو باہر آیا — اپنی ہستی سے بہت شرمایا
پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا — حُسن پر اپنے گماں تھے کیا کیا
موںھ جب آئینہ میں دیکھا جاکر — ہم کو اک شکل مُہیب آئی نظر
ہوا حیرت سے دگرگوں احوال — ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال
دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب — چھپ گئے غیروں کے آنکھوں سے عیوب
یک قلم ہوگئی نخوت کافور — بن گیا رشک ہمارا وہ غرور
ناخن فکر نے کی دل میں خراش — عیب جویوں کی لگی کرنے تلاش
جن کے طعنوں کی تھی ہم پر بھرمار — اُن کے ہم دل سے ہوئے شکر گزار
ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز — چل رہے تیر ہیں جن کے دل دوز
ان کا غصّہ ہے سراسر رحمت — زہر ہیں ان کے بھرا ہے امرت
انھیں بندوں کے ہیں ایماں سچے — یہی کافر ہیں مسلماں پکّے
قائم انصاف کا جب ہوگا نشاں — مانے جائیں گے انھیں کے احسان
بے خبر کب کے پڑے سوتے تھے — ان کی آواز سے ہم چونک اُٹھے
ان کے طعنوں نے جگایا ہم کو — زہر نے ان کے جلایا ہم کو
یار و اغیار کے عیب اور ہنر — آشکارا ہوئے ایک ایک ہم پر
حق کے جلوے نظر آئے ہر جا — اہلِ باطل میں بھی اک پائی ادا

ملا ہر راہ میں باطل کا سراغ　　اہلِ حق کو بھی نہ پایا بے داغ

اہلِ تقویٰ کی ریائیں دیکھیں　　اہلِ حکمت کی خطائیں دیکھیں

زشتیاں دیکھیں نکوکاروں میں　　خوبیاں پائیں گنہگاروں میں

کلب کی پاک سرشتی دیکھی　　پائے طاؤس کی زشتی دیکھی

عیب بھی دیکھے ہنر بھی دیکھے　　خار دیکھے تو نشتر بھی دیکھے

ہنر اعیار میں پائے اکثر　　عیب اپنے نظر آئے اکثر

دفترِ علم کو ابتر پایا　　علم کو جہل سے بدتر پایا

مجلسیں غیبت و بہتان سے پُر　　صحبتیں جھوٹ سے طوفان سے پُر

منقطع بھائی کی بھائی سے اُمید　　اپنا بیگانہ لہو سب کے سفید

پاک بندوں کی زباں پر دُشنام　　نہ ثقات اِس سے بری اور نہ کرام

فقرا مکر و ریا کے پتلے　　اغنیا حرص و ہوا کے پتلے

شیخ عیار تو زاہد پُرفن　　مولوی عقل کے سارے دشمن

پیاز کی طرح نرے پوست ہی پوست　　قوم کے دوست مگر ناداں دوست

حالت، القصہ جو دیکھی اپنی　　کوئی کل پائی نہ سیدھی اپنی

سارے آوے کو ٹٹولا جاکر　　کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر

پایا اک دین کا محکم قانون　　وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون

دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالتِ زار　　جی بھر آیا نہ رہا صبر و قرار

تھکو نہ تھا تلخ نوائی کا تحمل　　آہیں دو چار گئیں دل سے نکل

تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا
حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا

کلمۃ الحق

مرتّبہ ۱۹۶۳ء

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو — اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی — حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی
ہے ناگواری پہچان تیری — اَلحقُّ مُرٌّ ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے — چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
رشتے ہزاروں تو نے توڑے — باپوں سے بیٹے تو نے چھڑائے
سقراط کو زہر تو نے دلایا — شبیر کو قتل تو نے کرایا
بے جرم مسموم تو نے کرائے — سولی پہ معصوم تو نے چڑھائے
رخنے عرب میں تو نے نکالے — بدر و احد میں رن تو نے ڈالے
موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا — احمد سے مکّہ تو نے چھڑایا
تو نے صلے میں بخشے ہیں اکثر — سولی کے اورنگ کانٹوں کے افسر
مظلوم کتنے تیرے سہارے — ایلی ہی ایلی کہتے سدھارے
خونخوار لشکر ہیں ساتھ تیرے — رنگیں لہو میں ہیں ہات تیرے
تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں — سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں

تدبیر ہے تو ناکامیوں کی — تقریب ہے تو بدنامیوں کی
تو آشتی کی رہتی ہے دشمن — تو مصلحت سے رکھتی ہے ان بن
قطع و برش ہے تاثیر تیری — رہتی ہے ننگی شمشیر تیری
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر — و قربت سے ہوتے ہیں ابتر
پڑتی ہے ہل چل ہر مرحلے میں — آتی ہے دنیا اک زلزلے میں
حق معبدوں میں ہوتا ہے داخل — ہوتے ہیں جھوٹے معبود باطل
اٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا — ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا
عبرانیوں کا اڑتا ہے پرچم — شدت قبطیوں کی ہوتی ہے مدھم
ہوتے ہیں اغیار احمد کے ساکت — بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناطق

اے راستی گو کہ اے تیغ بُرّاں — تیرا مخالف کیوں ہو نہ ویراں
سب جھوٹ آگیں مضموں ہیں تیرے — زشت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے
گن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں — وہ تیرگی دشمن میں آخر ہوئے ہیں
اٹھا جہاں سے سیلاب تیرا — پھر واں کشتی ٹھہرے نہ بیڑا
اٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں — ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں
دیتی ہے ہمت ان کو سہارے — کرتی ہے امید جہاں اشارے
عزم ان کی مشکل کرتا ہے آساں — دل ان سے لاکھوں کرتا ہے پیماں
چھا جائے ظلمت گو بحر و بر میں — ہے روز روشن ان کی نظر میں

زور اُن پہ تیرے ہیں آشکارا — مٹھی میں اُن کی عالم ہے سارا
عظمت جہاں ہے تیری سمائی — پربت وہاں ہیں نظروں میں رائی
شاہوں سے گردن جھکتی نہیں واں — طوفاں میں کشتی رُکتی نہیں واں
اے راست گوئی تو ہے وہ افسوں — منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں
تلخی ہیں تیری طرفہ مزا ہے — ہر دل میں جچتی تیری ادا ہے
تو نے جہاں دی آواز جا کر — لاکھوں سر اُٹھے تیری صدا پر
ہوتی ہے دھیمی پرواز تیری — بڑھتی ہے کم کم آواز تیری
پھر دوڑتی ہے یوں مردوزن میں — جس طرح آتش لگتی ہے بن میں
بنتے ہیں دشمن انصار تیرے — ہوتے ہیں قیدی احرار تیرے
پطرس نے چھوڑے یار آشنا سب — پیرون پہ دیکھی تیری ادا جب
ڈالا عمر پر جب تو نے سایہ — ارقم کے گھر میں آ سر جھکایا
آہستہ سے تیری کرتے ہیں جو رم — ہیں گدگداتے دل اُن کے ہردم
جوں جوں وہ زد سے کرتے ہیں دوری — ضرب اُن پہ تیری پڑتی ہے پوری
جاتا ہے آہو جب چوٹ کھا کر — گرتا ہے آخر کچھ دور جا کر
تجھ سے بھی جو ہیں وحشی بدکتے — پھر پھر کے تجھ کو جاتے ہیں تکتے
گو حق کی تلخی پائے ہوئے ہیں — پر چوٹ دل پر کھائے ہوئے ہیں
بھاگے ہیں کھا کر زخم نہاں وہ — جائیں گے بچ کر تجھ سے کہاں وہ
دل دوز ہیں سب تیری ادائیں — کڑوی ہیں تیری ساری دوائیں

زہر ہلاہل برسوں پئیں جب — بیمار تیرے پائیں شفا تب
دیتی ہے اوّل تو زخم کاری — مرہم کی آخر آتی ہے باری
کل ہے مسرّت ہے آج غم تو — دیتی ہے امرت کہتی ہے سم تو
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت — تو جھوٹ پر وہاں کرتی ہے لعنت
جس جا تعصب ہے عین ایماں — انصاف کا غل کرتی ہے تو وہاں
رسم سلف پر مرتے جہاں ہیں — رسموں پہ حملے تیرے وہاں ہیں
تقلید جس جا ہے طوق گردن — تقلیدیوں سے ہے تیری اَن بن
کرتی ہے وہاں تو واعظ کو رسوا — ہے وحی منزّل قول اُس کا جس جا
وہاں مفتیوں پر ہیں تیرے دھاوے — ہیں مثل قرآں جس جا فتاوے
پُجتی ہیں قبریں جب اولیا کی — تو ہے دُہائی دیتی خدا کی
جس ملک میں ہے تیری غلامی — ہوتی ہے تو وہاں بردوں کی حامی
غُل بھیڑیوں کا پڑتا جہاں ہے — تو بکریوں کی وہاں پاسباں ہے
زہر اُس عسل کو تو ہے بتاتی — جس میں حلاوت ہے سب کو آتی
اُس نیش میں تو کہتی شفا ہے — نیش اجل کا جس میں مزا ہے
ہندی میں تیری تازی کی بو ہے — مشرق میں کہتی مغرب کی تو ہے
جس سرزمیں میں پانی ہے عنقا — تو چھیڑتی ہے وہاں ذکر دریا
ہر سو جہاں ہے طغیان باراں — شور العطش کا کرتی ہے تو وہاں
سانپوں کا خطرہ پاتی جہاں ہے — اندھوں کے آگے کرتی فغاں ہے

طوفاں کی آہٹ پہلے سے پاکر — بیڑوں میں چرچا کرتی ہے جاکر
ڈاکے کی آمد ڈاکے سے پہلے — کہتی ہے جاکر تو کارواں سے
بلبل ہے گل پر جب چہچہاتی — اُس دم خزاں سے تو ہے ڈراتی
پاتی ہے گھر میں جب کچھ دھواں تو — آگ آگ کا غُل کرتی ہے واں تو
جب دیکھتی ہے قومیں بگڑتی — ہے آگ میں تو قوموں کی پڑتی
کرتی ہے ظاہر اُن کی خطائیں — دیتی ہے اُن کو بیہودہ رائیں
گہ منعموں پر تو ہے برستی — گہ جھاڑتی ہے مفلس کی ہستی
دیتی ہے طعنے بے غیرتوں کو — کرتی ہے رسوا بے عزتوں کو
للکارتی ہے تو کاہلوں کو — پھٹکارتی ہے تو جاہلوں کو
جھڑکی ہے تیری عادت میں داخل — تُرشی ہے تیری طینت میں داخل
بگڑے ہیں تجھ سے دل بے نہایت — لاکھوں نے کی ہے تیری شکایت
یہاں نام تیرا جس نے لیا ہے — عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
احکام تیرے ٹلتے رہے ہیں — تیرے نوشتے جلتے رہے ہیں
پہنچایا جس نے پیغام تیرا — جمہور میں وہ بدنام ٹھہرا
کتنوں نے جانا ساحر نبی ﷺ کو — کتنوں نے مانا کافر علیؑ کو
طوفان اُٹھائے اہل ہدیٰ پر — بہتان باندھے زین العبا پر
نعمان کو دی بدعت سے نسبت — کی شافعی پر برپا قیامت
مالک پہ لائے آفت جفا جو — یہاں تک کہ اُکھڑا مفصل سے بازو

کی ابنِ حنبل کی یہ مدارا چہرہ پہ تھوکا کوڑوں سے مارا
نکلے آئمہ اکثر وطن سے خالی ہوا رے ابنِ حسن سے
کتنوں کی باندھیں ذلّت سے مشکیں کتنوں کے رسّی ڈالی گلے میں
مرتد بتایا اہلِ یقیں کو ٹھہرایا زندیق اربابِ دیں کو

اے کلمۂ حق تیری بدولت مردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
ٹھہرے جہاں میں بیگانے سب سے تجھ پر ہوئے وہ دیوانے جب سے
دُنیا نے اُن پر گو ظلم توڑا دامن اُنھوں نے تیرا نہ چھوڑا
ہے تلخ و شیریں ہر بات تیری سُننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی
کانوں کو تو ہے گو ناگوارا مونھ سے نکلنا تیرا ہے پیارا
جو حرفِ حق سے بھاگے بگڑ کر حق اُن کو لایا گردن پکڑ کر
حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں نت حق کے دعوی غالب ہوئے ہیں
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

اَے راست گوئی اَے ابرِ رحمت ہے اِس چمن میں سب تیری برکت
گر تو نہ ہوتی یہاں سایہ افگن برباد ہوتا کب کا یہ گلشن
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
باغِ جہاں کو چھانٹا ہے تو نے اکثر خزاں کو ڈانٹا ہے تو نے

تو بے کسوں کی یاور رہی ہے
تو گمرہوں کی رہبر رہی ہے

جن بستیوں میں تو چھائی
کھیتی اُنھیں کی یہاں لہلہائی

بند اپنی جس جا تو نے زباں کی
نکبت نے لی منزل آ کر وہاں کی

رہبر نہ ہوتا گر نور تیرا
یوناں میں ہوتا ہر سو اندھیرا

گر مصر کی تو کھوتی نہ خامی
مصری نہ ہوتے عالم میں نامی

سیریا میں حق کا جھنڈا نہ گڑتا
سایہ اگر واں تیرا نہ پڑتا

جُنبش نہ ہوتی گر تیرے لب کو
قبلہ نہ کرتے خاکِ عرب کو

ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملت
سر سبز تجھ سے نوبت بہ نوبت

مشرق میں جب تھی تیری حکومت
چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت

جب دَور تیرا مغرب میں آیا
مغرب کو تو نے مشرق بنایا

کھلتے رہے ہیں گُل تیرے ہر سو
مہکی ہے اکثر یہاں تیری خوشبو

گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے
پر تیری دارو صحت فزا ہے

ہر بول تیرا جوشِ غضب میں
ہے حق کی آواز راہِ طلب میں

گو علم کی تو ہے زندگانی
پر جہل تیرا دشمن ہے جانی

جاہل ہمیشہ تجھ سے لڑے ہیں
ناداں ہزاروں تجھ سے اڑے ہیں

لاکھوں بلائیں آئی ہیں تجھ پر
اکثر گھٹائیں چھائی ہیں تجھ پر

ملکوں نے تجھ پر حملے کئے ہیں
قوموں نے تجھ سے بدلے لئے ہیں

اے کلمۂ حق اے ستر یزداں   جس وقت ہو تو پردہ سے عُریاں
ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے   دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے

عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالی کو رکھیو اپنا شناسا

مناظرہ واعظ و شاعر

مرتبہ ۱۸۸۳ء

کل جو میں نے بستر راحت پہ جا کر دم لیا   دل کو اک وقفہ غم دنیا سے فرصت کا ملا
کی تصور نے وہیں اک بزم رنگیں آشکار   مجلس ارباب معنی جس کو کہنا ہے بجا
گرم تھا واں ہر طرف ہنگامۂ بحث و نظر   سرخرو گلگونۂ حجت سے تھا ہر مدعا
شمع استدلال میں روشن تھا فانوس بیاں   چارسو ہنگامہ آرا تھی لم و لا کی صدا
تھے فراہم جس قدر اس بزم میں اہل کمال   تھا شرف کا اپنے اپنے فن کے سب کو ادعا
مولوی کہتے تھے غیر از علم دیں سب ہیچ ہے   فلسفی کہتے تھے ہر فن کی ہے حکمت پر بنا
صوفی صافی ادھر کچھ کہہ رہا تھا زیر لب   واعظ معجب اُدھر کچھ بک رہا تھا بر ملا
خود فروشی کا غرض تھا ہر طرف بازار گرم   ساز گوناگوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا
شاعر مغرور بھی اک سمت خنداں زیر لب   سن رہا تھا لاف اہل فضل اور خاموش تھا
جا کے پہنچا جب وہاں تک دور صہبائے سخن   دفعتہً مجلس سے اُٹھا اور یہ بولا خود ستا
دعوی فضل و براعت اس کو زیبا ہے یہاں   جو کوئی تلمیذ رحمٰن تم میں ہو میرے سوا

ہے تصرّف میں ہمارے عرصۂ دشتِ خیال کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا
رہروی میں ہم کو چشم و گوش پر تکیہ نہیں ہیں ہمارے بال و پر اندیشۂ منکر رسا
صاف ہوتا ہے بیاں اپنا خس و خاشاک سے پاک ہو جیسے وساوس سے دلِ اہلِ صفا
اتفاقاً گر کسی کی مدح پر آ جائیں ہم خاطرِ دشمن میں اس کا نقش اُلفت دیں بٹھا
خاک کو چرخِ بریں پر دیں اگر ترجیح ہم مانند ہو ذرّے کے آگے مہرِ تاباں کی ضیا
وصفِ خوباں ہم سے گر سُن پائے سالک ایکبار ہو نہ ہرگز بہرۂ عشقِ مجازی سے رہا
گر کریں ہم گلرخوں کی بیوفائی کا بیاں ہو نہ بلبل پھر چمن میں روے گل پر مبتلا
کھینچ دیں گر خاطرِ مشتاق کی تصویرِ شوق قیس کی کرنی پڑے لیلی کو جا کر التجا
ہیں ہماری مدح کے پیر و جواں اُمیدوار اور ہماری ہجو سے تھرّاتے ہیں شاہ و گدا
گرمیٔ بزمِ حریفاں ہے ہماری ذات سے بادۂ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی مزا
فکر اپنی لغزشِ اہلِ نظر سے پاک ہے ہم جہاں چلتے ہیں وہاں مسدود ہے راہِ خطا
کچھ نہیں اپنا ضرر گر ہو روایت میں خلل جھوٹ سے ہوتی ہے یہاں رونقِ عبارت کو سوا
دی نہیں گویا شریعت نے ہمیں تکلیف کچھ جو نہیں جائز کسی کو ہے وہ سب ہم کو روا
خود ستائی جو کسی کو جز خدا پھبتی نہیں آ کے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوشنما
فحش اور دُشنام کو ملتا ہے یہاں رنگِ قبول گالیاں دیدے کے ہم سنتے ہیں اکثر مرحبا

جب یہ بالا خوانیاں شاعر کی واعظ نے سُنیں مُسکرایا اور یہ فرمایا کہ اے ہذیاں سرا
شیوہ تیرا بوالفضولی اور یہ لاف و گزاف پیشہ تیرا ہاد خوانی اور اتنا ادّعا

اُمتِ بر حق کے عالم جو ہیں از روئے خبر   وارثِ علمِ نبی قائم مقامِ انبیا

کیا ادب جاتا رہا اِن کا بھی تجھ کو اے سفیہ   ہر سرِ مجلس ہے تو جو اس طرح بنکارتا

گو نہیں گنتی میں اہلِ علم کی یہ خاکسار   پر سُنے جاتے نہیں یہ تیرے دعوے ناروا

ہر سخن کا اِک جُدا ہوتا ہے موقع اور محل   ہزل و سخریت کجا بزمِ خردمنداں کجا

علم اور حکمت کے ہوں جس بزم میں دفتر کھلے   کس نے دی ہے تجھکو واں اس ہرزہ گوئی کی رضا

شعر مستحسن اگر ہوتا۔ تو قرآں میں اُسے   کیوں خلافِ شانِ ختم المرسلیں کہتا خدا

شان میں [1] بالعلم یزری جس کی آیا ہے صریح   فخر ہے اُس شعر پر تجھ کو یہ اے شر الوریٰ

چاہیئے التماس اہلِ [2] الذکر سے ہو مستفید   ہو نہ جس کو علم سنت اور کتاب اللہ کا

خود ہو تم بے علم اور صحبت سے اہلِ علم کی   بھاگتے ہو جیسے شیطاں ہے اذاں سے بھاگتا

ہے یہی باعث کہ بک اُٹھتے ہو تم بے اختیار   جو تمہارے مُنہ میں آتا ہے سزا اور ناسزا

اُس زبان یاوہ گو کو اپنی کیا سمجھا ہے تو   جرم گو چھوٹا ہے اُس کا جُرم ہے لیکن بڑا

ہے حقیقت میں ترے سارے خیالاتِ بلند   ہجو ہے تو بے اثر اور مدح ہے تو بے صفا

ہے جہاں خامے کو تیرے خدمتِ مشاطگی   مورت اک پتھر کی ہے وہاں حورِ جنت سے سوا

بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر   رات سے تاریک تر ہجرِ صنم میں دن ترا

شش جہت میں تو کرے برپا قیامت بار بار   یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جدا

تیغ چوبیں کی ہو گر بندش بیاں کرنی تجھے   ہے تنزل گر اُسے ٹھہرائے تو تیغِ قضا

---

[1] عرب میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ الشعر یزری بالعلماء یعنی شاعری عیب لگاتی ہے علم کو۔ ۱۲

[2] اہل الذکر سے مراد علمائے دین ہیں۔ ۱۲

ہو جہاں لکھنی تجھے اسپِ گلی کی جست و خیز — اِک ترارے میں اُسے پہنچائے تو فوق السما

تو ہوا مدح و ثنا میں جس کی سرگرمِ غلو — اور اُلٹا خوبیوں پر اُس کے پردہ پڑ گیا

پرلے درجے کا تنزّل ہے اگر ٹھہرائے تو — جم کو اُس کے در کا درباں اور بہمن کو گدا

بہمن و جمشید یہاں بیچارے کس گنتی میں ہیں — تنگ ہیں ہاتھوں سے تیرے انبیا اور اولیا

لکھے تو اک گربۂ مسکیں کو سارا منزلت — اور کہے اک لعبتِ سنگیں کو تو یوسف لقا

فی المثل گر ہو ترا ممدوح اک برگِ گیاہ — اُس میں ثابت کر کے چھوڑے تو صفاتِ کبریا

باد خوانوں سے سوا ہو تجھ کو فکرِ تہنیت — خواب میں سن پائے تو گر کوس شادی کی صدا

ہند میں غُل ڈال دے تو نالہائے شوق سے — چین میں شہرہ ہو گر اک شاہدِ نوخیز کا

شعر کو الہام سمجھے گر نصیبوں سے کبھی — کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا

مذہبِ شاعر میں جس کا دین باطل نام ہے — راستی اور صدق سے بڑھ کر نہیں کوئی خطا

سر بسر اقوال تیرے کچھ ہیں اور افعال کچھ — ہے زبانِ گوہر افشاں پر نعم اور دل میں لا

شان میں آیا ہے جن کی قول ما لا یفعلون[1] — چشم بد دور آپ کے ہادی ہیں وہ اور مقتدا

ایسے دروازے بہت کم پائیں گے آفاق میں — جن پہ صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا

ہے زبانِ خامہ تیری تابعِ فرمانِ حرص — کام تجھ کو کچھ نہیں جز مدح و قدحِ اغنیا

مدح میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو — گالیاں دیتا ہے تو اکثر انھیں کو برملا

جیسے دروازوں سے پھرتے ہیں دعا دے کر فقیر — مدح تو بھی ختم کرتا ہے یونہیں دے کر دعا

۱؎ قرآن میں شعرائے جاہلیت کی نسبت فرمایا ہے کہ اِنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ
یعنی وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے ۔ ۱۲

ہر دعا میں ہے بقدرِ شرطِ ان اعطیتنی — صاف لعنت کا دعا میں تیری آتا ہے مزا
پردۂ عرضِ ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو — گر یہی ہے شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

زہر دل کا جب کہ واعظ نے لیا سارا اُگل — اور نہ کوئی تیر باقی اُس کے ترکش میں رہا
سن کے شاعر نے کہا بس اے خدنگ انداز بس — ہے زباں تیرے دہن میں یا سنانِ جانگزا
چوٹ تھی تیری سخن پر جا پڑی اخلاق پر — تو نے چاکِ پیرہن کو تا جگر پہنچا دیا
خردہ گیری کے لئے حاضر ہے شاعر کا کلام — اِس سے کیا مطلب کہ بہت وہ بندۂ حرص و ہوا
تو اگر معصوم ہو تو کچھ کہی جاتی نہیں — پھنس رہا ہے ورنہ اس کے پھندہ میں شاہ و گدا
کھیلتے پھرتے ہیں میدانِ جہاں میں سب شکار — آڑ میں ٹٹی کے لاکھوں اور ہزاروں برملا
حرص ہوتی جسم میں انسان کے گر جائے خون — شاعروں سے تیرے چہرے کی دکاں ہوتی سوا
میں نے ان آنکھوں سے اے واعظ لباسِ علما میں — جو فروشی کرتے دیکھے ہیں بہت گندم نما
خبط ہے اِک تم کو۔ کہہ دوں گر بُرا مانو نہ تم — آپ ہو بیمار اور اوروں کو دیتے ہو دوا
آپ ہیں تسبیح و ذکر و طاعت و زہد و ورع — خوبیاں سب کچھ سہی پر ان کا مالک ہے خدا
میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے — جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے بُرا
بات حق ہو یا کہ باطل تیری مرضی کے خلاف — مونھ سے نکلی اور سمجھے تکفیر کا پہلو ملا
ترک اولے پر فضیحت جس قدر کرتا ہے تو — قتلِ انساں پر نہیں ملتی کہیں ایسی سزا
ہے فقط دوزخ تری سرکار میں جنت نہیں — چوک جس سے ہو گئی کچھ پھر نہیں تو بخشتا
عاصیوں کی مغفرت جن سے نکلتی ہے صریح — ایسی آیات اور حدیثوں سے ہے تو جی میں خفا

گر خدا بھی واعظو ہوتا تمھیں سا سخت گیر — اس چمن کو دیکھتا کوئی نہ پھر پھولا پھلا
گرم بازاری اسی میں اپنی بس سمجھے ہو تم — لوگ ہوں بدراہ ۔ اور ان کے بنو تم رہنما
چاہتے ہو تم یہاں کثرت معاصی کی نہیں — ہیں اطبا چاہتے جس طرح امراض اور وبا
آپ ان باتوں کو اک بہتان سمجھیں گے مگر — سوجھتی اکثر نہیں انسان کو اپنی خطا
جو کہوں میں اس کو باور کر نہیں اس میں خلاف — شاعروں کے کذب سے بدتر ہے واعظ کی ریا
یہ بھی کوئی جھوٹ ہے ہم جس کے خود ہیں معترف — جھوٹ وہ ہے جو ہو پردے میں تقدس کے چھپا
دعوتوں میں سچ بتا جس شوق سے جاتا ہے تو — ایک بھی کی ہے نماز اس شوق سے تو نے ادا
یاد ہے وہ تیرا کہنا دیکھ کر کھانے چنے — دین[۱] قائم ہے ابھی یارو کرو شکر خدا
مدرسے کوشش سے تیری گو بنے ہیں شہر شہر — مسجدیں بھی تو نے بنوائی ہیں اکثر جا بجا
پر یہ حیرت ہے کہ ان کاموں میں جو لاگت لگی — اس سے وہ چند آپ کے دیوان خانہ میں لگا
مجرموں کے جرم شاید ہوں نہ اتنے خوفناک — نیکیاں تیری ہیں جتنی پر خطر روز جزا
ہے یقیں اتنا ہی ہوگا اپنے دل میں تو حقیر — جس قدر مانا ہے زید و عمر نے تجھ کو بڑا
کر دیا رسوا تری تزویر نے تذکیر کو — ورنہ اک منصب تھا یہ شایان شان انبیا
لطف ہے تو دلربا اور قہر ہے تو دلفریب — سحر ہے افسوں ہے جادو ہے تری جو ہے ادا
گر جہنم سے ڈرا کر چاہتا رشوت ہے تو — گاہ حوروں پر لبھا کر مانگتا ہے رونما
گو سنبھالا ممبر پہ ہے یوں بیٹھ کر گویا کہ آپ — آسماں سے لے کے اترے ہیں ابھی حکم خدا

۱؎ یعنی علما کی دعوت میں ایسے ایسے تکلفات کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں دیندار لوگ ابھی موجود ہیں اور دین قائم ہے ۔ ۱۲

ہات میں تیرے ہے گویا نارِ جنت کی کلید
جس نے پوجا تجھ کو وہ فردوس میں داخل ہوا

نیکیاں برباد ہیں ساری تری خدمت بغیر
فرقۂ ناجی ہے بس اک پوجنے[1] والا ترا

اپنی اک امت الگ سب سے بنانے کے لئے
تفرقے ڈالے ہیں دینِ حق میں تو نے جا بجا

تیرے گھر سے ہیں مسلمانوں میں ہے جنگ و نزاع
اختلافِ امت کا حق میں تیری رحمت ہو گیا

جس طرح جھگڑوں کے خواہاں ہیں عدالت میں وکیل
مانگتا ہے تو یونہیں باہم خصومت کی دعا

چاہتا ہے قوم میں جوتی سدا چلتی رہے
کشتیِ اسلام کا پھر کیوں نہ ہو تو ناخدا

شاعروں کو بس اسی منھ سے گدا کہنا ہے تو
اے اسیرِ دامِ نفس اے بندۂ حرص و ہوا

کچھ گدا کہنے سے تیرے ہم گدا ہوتے نہیں
ورنہ ہم بھی یوں تو کہہ سکتے ہیں شیخوں کو گدھا

شاعری پر ہے بڑا یہ طعن حضرت کا کہ ہم
حد سے بڑھ جاتے ہیں جب کرتے ہیں مدحِ اغنیا

طعن کچھ بیجا نہیں رکھتے ہیں پر اک عذر ہم
غور کرنا عذر پر ہے شیوۂ اہلِ صفا

سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگوں کا پیشہ ہے مدح
جیسے تم لوگوں کا پیشہ ہے یہی مکر و ریا

اپنے اپنے کام اور پیشہ میں ہم ہوں یا کہ تم
کرتے ہیں ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا مقتضا

وعظ میں دیتے ہو آخر داستاں کی چاٹ تم
راستی سے کام جب چلتا نہیں تسخیر کا

مدح میں ہم بھی یونہیں کرتے ہیں رنگ آمیزیاں
جب تنِ ممدوح پر کھلتی نہیں سادی قبا

پھول پھل سے سرو کو بے بہرہ جب پاتے ہیں ہم
ایک طرّہ اس میں آزادی کا دیتے ہیں لگا

سوسن و نسرین و گل میں جب وفا پاتے نہیں
وصفِ رنگ و بو سے ہم لیتے ہیں عیب ان کا چھپا

پر ہم اس پردے میں خود اپنا دکھاتے ہیں کمال
ورنہ ایسی مدح ہے ممدوح کے حق میں ہجا

---

[1] پوجنا اور محاورے میں نذر کرنے کو کہتے ہیں۔

اِس سے بڑھ کر ہجو ہو سکتی ہے کیا انسان کی
لکھیں اعمیٰ کو بصیر اور راہزن کو رہنما

عدل میں لکھتے ہیں ہم نوشیرواں عہد انھیں
ایک منکوحہ کا حق ہوتا نہیں جن سے ادا

حاتمِ وقت اُن کو ٹھہراتے ہیں جن کا بذل و جود
اِس لئے ہے تاکہ حاصل حاکموں کی ہو رضا

زیرکی میں اُن کو کہتے ہیں ارسطوئے زماں
ہمنشیں احمق بناتے ہیں جنھیں صبح و مسا

کہتے ہیں کس شد و مد سے ہم انھیں بیدار مغز
جو نہیں واقف کہ آمد کیا ہے اور ہے خرچ کیا

جو غلامانہ خوشامد کرتے ہیں حکام کی
اُن کی آزادی پہ ہم کہتے ہیں سو سو مرحبا

اُن میں ثابت کرتے ہیں ہمدردیِ نوعِ بشر
آپ کو گنتے ہیں جو نوعِ بشر سے ماوریٰ

حامیِ اسلام دیتے ہیں خطاب اُن کو کہ جو
کرتے ہیں رسوا چلن سے اپنے نام اسلام کا

یاورِ خلق اُن کو کہتے ہیں جنھیں لے دے کے ہو
تُم کسی کے کام کا رکھتے نہیں اپنے سوا

مدح کی جاتی ہے یہاں اکثر اسی انداز سے
شیخ ہو ممدوح یا واعظ غنی ہو یا گدا

قطبِ دوراں اُن ریاکاروں کو ٹھہراتے ہیں ہم
آپ کو بھی جو سکھائیں مدتوں مکر و دغا

اُن فسوں سازوں کو ہم لکھتے ہیں ذوالنونِ زماں
بیٹھ کر منبر پہ جو آنکھوں کا کاجل لیں اُڑا

آپ جھٹ اُس کو کہے جو ہاج وہ بے مغز ہے
نام اسی کا مدح ہے تو ہجو ہے پھر چیز کیا

پھبتی اور دُکھتی سخنور نے یہ کی تقریر جب
اور لگے سب مسکرانے دیکھ کر یہ ماجرا

دل میں واعظ نے پڑھی لاحول اور سمجھا کہ میں
چھیڑ کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا

پر بظاہر داغ یہ دامن سے دھونے کے لئے
ہنس کے اک سنجیدگی سے اور متانت سے کہا

ہو چکیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ اور ذکر
ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے بُرا

کیجئے فکرِ شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق
آپ نے دیواں مرتب کیوں نہیں اپنا کیا

ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجئے انصاف اگر ہے غزل میں آپ کی دیوانِ حافظ کا مزا
عرض کی شاعر نے حضرت کا ہے یہ حُسنِ ظن ورنہ میں کیا اور مرا مجموعۂ اشعار کیا
قبلہ اب وہ دن گئے جو شاعروں کی قدر تھی شاعری اور نکتہ پردازی میں ہے اب کیا دھرا
شعر اگر کہئے تو روٹی جا کے کس گھر کھائیے سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تنگدست اور بینوا
اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی اُستاد کا
اس گئے گزرے زمانہ میں بھی یہ فنِ شریف کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا
آپ لوگوں کی تو اس میں ریس کرنی ہے محال پر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ نہ کچھ آ جائے گا
روزگر سونے کی چڑیا گر نہ ہات آئی نہ آئے ہم گنہگاروں کا پیٹ ایسا نہیں ہے کچھ بڑا
کی سخن پرداز نے واعظ سے جب یہ گفتگو قہقہوں سے چار سو مجلس میں اک غُل پڑ گیا
خواب کا سا وہ سماں جاتا رہا سب یک بیک اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا

ہزل ہو یا جد نصیحت لیجئے ہر بات سے
کہہ گئے ہیں اہلِ دل دع ما کدر خذ ما صفا

جشن جوبلی

مرتبہ ۱۸۸۷ء

ہے عید یہ کس جشن کی یا رب کہ سراسر ہے جوبلی ہے جوبلی ایک اک کی زباں پر
یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب ست جُگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر

وہ دورِ تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف ۔۔۔ وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر

جمشید پہ جب آگ ہوئی سنگ سے ظاہر ۔۔۔ ایراں میں کیا جشن سدہ اس نے مقرر

اس عہد ہمایوں میں ہزار ایسے کرشمے ۔۔۔ ظاہر ہوئے اس طرح کہ عقلیں ہوئیں ششدر

یہ جشن مبارک ہے بہت جشن سدہ سے ۔۔۔ وہ آگ نکلنے کا یہ بجھنے کا ہے مظہر

اس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے ۔۔۔ تھی جن کی ہوا سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر

اس عہد نے وہ خون بھرے ہات کئے قطع ۔۔۔ جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر

بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب ۔۔۔ جو لوگ روا رکھتے تھے خونریزیِ دختر

جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی ۔۔۔ دی زندگی اک اور انھیں علم پڑھا کر

اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت ۔۔۔ انساں کو نہ سمجھا کسی انسان سے کمتر

دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی ۔۔۔ گویا وہ ستی ہو گئی خود عہدِ کہن پر

نابود کیا اس نے زمانہ سے ٹھگی کو ۔۔۔ اک قہر تھا اللہ کا جو نوعِ بشر پر

اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ ۔۔۔ مظلوم نہ اب بیل نہ گھوڑا ہے نہ خچر

اے نازشِ برطانیہ اے فخرِ برنزک ۔۔۔ اے ہند کے گلہ کی شباں ہند کے قیصر

سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا ۔۔۔ محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر

تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا ۔۔۔ اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر

---

۵ یہ قصیدہ انجمن اسلامیہ لاہور کے ایڈریس کے ساتھ انجمن کی طرف سے بحضور ملکہ معظمہ قیصرِ ہند گزرانا گیا تھا۔

بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں نہ ہندو — معمور مساجد ہیں تو آباد ہیں مندر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا — سنکھ اور اذاں گو بجتے ہیں روز برابر

گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار — احساں مگر اسلام پہ اُس کے گراں تر
معلوم ہے جو موروں پہ اسپین میں گزری — جس وقت از بلا ہوئی وہاں صاحب افسر
حالت وہی اس ملک میں پہنچی تھی ہماری — گر آتا نہ اگر اُس کا لشاں ہند میں آکر

اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری — ہر قوم کے ہیں پیر و جواں متفق اس پر
اُمید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو — راحت کی کسی سایہ میں جز سایۂ قیصر

گر برکتیں اس عہد کی سب کیجئے تحریر — کافی ہے نہ وقت اُسکے لئے اور نہ دفتر
ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جبتک — آزادی و انصاف حکومت کے ہیں جوہر

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ

پھوٹ اور ایکے نے کی یہ گفتگو — میں ہوں جہاں کا چمن آرا کہ تو
میرا ہے یا تیرا مبارک قدم — تجھ سے ہے یا مجھ سے بقائے اُمم
اپنی ستائش نہیں زیبا مگر — حق نہ جتاؤں تو ہے خوفِ ضرر
منزلِ ہستی کا ہوں میں رہنموں — کچھ نہ ہو لے پھوٹ اگر میں نہ ہوں
مجھ سے ہی اجسام کو ہے التیام — مجھ سے ہی اجرام میں ہے انتظام
میری بدولت ہے کھچا اور تنا — جال یہ سب ثابت و سیّار کا
میرا اگر ہو نہ قدم درمیاں — زیر و زبر ہو ابھی نظمِ جہاں
دانوں کو دیتا ہوں میں خرمن بنا — قطروں سے دیتا ہوں میں دریا بہا
ڈھیلوں سے چُنتا ہوں حصارِ حصین — ریشوں کو کر دیتا ہوں حبل المتین
میں ہوں اگر موروں کے درمیاں — اُن کا سلیماں کو کروں میہماں
مجھ سے ہے ہر قوم اعانت طلب — کرتے ہیں طاقت میری تسلیم سب
قوموں کے اقبال کی ہیں ہوں دلیل — میں نہیں جس قوم میں وہ ہے ذلیل
مجھ سے گھرانوں کی ہے چھاتی پہاڑ — میں نہیں جس گھر میں وہ گھر ہے اُجاڑ
ملک ہیں آباد میری ذات سے — بن ہے اِک میری کرامات سے
میں نے ہے جس قوم کو بخشا وقار — قوم وہی قوم ہے باقی کھار

بخت عدو مال ہے اُس قوم کا — بندہ خود اقبال ہے اُس قوم کا
نرغہ میں گھر جائے گر ایک اُنکا فرد — لاکھ پہ بھاری ہے بوقتِ نبرد
ڈال نہیں سکتا کوئی اُس پہ ہاتھ — سوجھتی ہے قوم تمام اُس کے ساتھ
میرا ہے جس ملک میں جاری عمل — واں کبھی آنے نہیں پاتا خلل
میرے تصرّف میں ہے جو سرزمیں — واں کوئی بیکس کوئی تنہا نہیں
ایک ہے زخمی تو ہیں سب دلفگار — ایک ہے مظلوم تو حامی ہزار
ایک کو گر دیکھتے ہیں مضطرب — پیٹ کو پکڑے ہوئے پھرتے ہیں سب
آگ اگر گھر میں لگی ہے ایک کے — قوم میں گھر گھر دھوئیں اُٹھنے لگے
کُل کی مصیبت میں ہیں کُل مبتلا — ایک پر آتی نہیں کوئی بلا
ضعف دباتا نہیں اُن کو کبھی — رکھتے ہیں کمزور بھی واں دل قوی
غم نہیں افلاس کا مفلس کو واں — ایک کا افلاس ہے سب پر گراں
ایک کی خواری سے ہیں نادم ہزار — ایک ہے رسوا تو ہیں سب شرمسار
ایک کی عزّت ہو تو نازاں ہیں سب — ایک ہو گر شاد تو شاداں ہیں سب

سنتی ہے اے خانہ بر انداز جھوٹ — سچ ہے یہ سب میرا بیاں یا کہ جھوٹ
مجھ میں نہیں عیب کچھ اِس کے سوا — ساتھ میرے تیرا ہے کھٹکا لگا
ذات ہے میری مہ کامل مگر — دیتی ہے گہنا مجھے تو آن کر
ہوتی اگر تیری نہ یہاں ہست و بود — میرا مبارک تھا جہاں میں وجود

چشمۂ رحمت ہے جماعت وے — کرتی ہے تو آکے مکدر اُسے
چار جو مل بیٹھتے ہیں یہاں کبھی — سب نظرِ بد سے ہیں لرزاں تری
صلح کا رہتی ہے بُرا تکتی تو — دو کو بہم دیکھ نہیں سکتی تو
قطع و بریش تیری جبلّی ہے خو — گوشت جُدا کرتی ہے ناخن سے تو
بھائیوں کو کرتی ہے اغیار تو — یاروں کو کر دیتی ہے بے یار تو
ڈالتی ہے اُن میں نزاع اور خلاف — دو کے نہیں چھوڑتی دل اُن میں صاف
قوم میں جو دیکھئے چھوٹا بڑا — چُنتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جُدا
مضحکہ خود اپنا بناتے ہیں وہ — اپنے پہ عالم کو ہنساتے ہیں وہ
سوجھتی ملّت کی نہیں کوئی بات — یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات
رہتا ہے ایک ایک کے درپے نہاں — جس کسی کو دیکھئے ہے بدگماں
زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ — دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ
ایک یہ کہتا ہے کہ میری چلے — دوسرا خواہاں کہ نہ اس کی چلے
دیکھئے جس کو وہ ہے اس تاک میں — یاروں کے منصوبے ملیں خاک میں
قوم کی قوم آتی ہے بیکس نظر — جاتی ہیں جھاڑو کی سی سینکیں بکھر
عیب ہیں جو تجھ میں وہ مجھ میں نہیں — خوبیاں جو مجھ میں ہیں تجھ میں نہیں

پھوٹ نے ایکے سے سُنا جب یہ لاف — بولی کہ تقصیر ہو میری معاف
نام ہے بدنام مقرّر میرا — ذکر بُرائی سے ہے گھر گھر میرا

پر کوئی انصاف سے دیکھے اگر — میں ہوں وہی جو کہ تو ہے سر بسر
عیب ہیں کچھ مجھ میں تو تجھ میں بھی ہیں — خوبیاں تجھ میں بھی ہیں مجھ میں بھی ہیں
خلق کے ہم دونوں مددگار ہیں — دوست کا تو یار ہے دشمن کی میں
اپنوں سے تو غیر کو کرتا ہے زیر — میں ہوں کہ دل غیروں کے رکھتی ہوں شیر
میں کروں تائید نہ تیری اگر — ہو کوئی خوبی نہ تیری جلوہ گر
کام رہیں سارے ادھورے تیرے — ہوں کبھی منصوبے نہ پورے تیرے
میرے ہی بل چلتی ہے گاڑی تیری — مجھ سے ہی سرسبز ہے باڑی تیری
میں جو نہ ایراں کو دلاتی شکست — رومیوں کے حوصلے ہو جاتے پست
ڈالتی بغداد میں گر میں نہ جال — کرتی نہ عباسیوں کو پائمال
کام نہ آتا کوئی تیرا ہنر — فتح نہ پاتی کبھی فوج تتر
ہوتی بخارا میں نہ گر میں مخل — کرتی نہ سامانیوں کو مضمحل
غزنوی اس طرح نہ پاتے فروغ — ٹھہرتے دعوے ترے سارے دروغ
ہند میں میں گل نہ کھلاتی اگر — رنگ نہ یہاں اپنا جماتی اگر
غوریوں کو فتح دلاتا نہ تو — خلجیوں کے کام کچھ آتا نہ تو
لودیوں کے بڑھتے نہ آگے قدم — مغلوں کا یہاں آ کے نہ گڑتا علم
ہند میں کرتی نہ اگر میں وطن — پھیلتے مغرب کے نہ یہاں علم وفن

یہ تو لیا تو نے سن اے اتفاق — اب کہوں کچھ اور جو گزرے نہ شاق

تجھ سے سوا جس میں ہے سچ اسکو جان — جلوہ گر انصاف الٰہی کی شان

تو کبھی قوم کا بنتا ہے یار — چاہتا ہے بگڑے نہ وہ زینہار

اس کو نہ پیش آئے کبھی روز بد — بات رہے اس کی بنی تا ابد

حصہ میں اس کے رہے عز و شرف — رشک سے قومیں تکیں اس کی طرف

آئے نہ اقبال کو اس کے زوال — دوست ہیں شاد عدو پائمال

تیرا تو یہ فیصلہ ٹھہرا مگر — عادت حق کی نہیں تجھ کو خبر

آج کسی کو جو چڑھاتا ہے وہ — دوسرے دن اس کو گراتا ہے وہ

جب رہے دنیا میں اثر حضور — عزت و دولت کی ہے اک عمر دور

ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور — سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور

خصلتیں ان کی نہیں رہتیں درست — فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سست

بھول کے بھی وہ نہیں لاتے بجا — بندوں کے حق اور حقوق خدا

ملتی ہے ہر چند کہ مہلت انھیں — پر کبھی ہوتی نہیں عبرت انھیں

جب نہیں غفلت کا اترتا خمار — ہوش میں آتے نہیں وہ زینہار

کرنے سزا سے نہیں پھر در گزر — کارگزاران قضا و قدر

لیتے ہیں چھین ان سے حکومت کبھی — کرتے ہیں سلب انکی لیاقت کبھی

علم کبھی دیتے ہیں ان کا مٹا — دیتے ہیں دولت کبھی ان کی لٹا

اس پہ بھی ہوتے نہیں جب ہوشیار — بھیجتے ہیں تحفۂ وبا بار بار

کوئی سے یہ گیا کہ گر سنبھل — سر سے بلا قوم کے جاتی ہے ٹل

ورنہ مجھے کرتے ہیں مامور وہاں — تاکہ کروں قدرتِ باری عیاں

الحذر اُسوقت سے اے اتفاق — آن کے جب کہتی ہوں میں الفراق

آگئے اُس قوم کے بس دن بُرے — حق نے کیا جس پہ مسلّط مجھے

کوہ کو کرتی ہوں پرِ کاہ میں — شیروں کو کر دیتی ہوں روباہ میں

قدر و بہا قوم کی لیتی ہوں چھین — کوڑی کے کر دیتی ہوں میں تین تین

کرتے نہیں غیر اُنھیں آ کے پست — پاتے ہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں شکست

دیتے ہیں دھیان اُنکا بداندیش چھوڑ — آپ ہی مرجاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ

آگ پہ گویا کہ ہوں بارود میں — قوموں کو کر دیتی ہوں نابود میں

ہوگیا جس ملک میں یہاں میرا راج — قحط و وبا کی نہیں وہاں احتیاج

قحط و وبا کرتے ہیں جانیں تلف — کھوتی ہوں میں قوم کا عزّ و شرف

دیتے ہیں وہ قوم کی گنتی گھٹا — کرتی ہوں میں قوم کو بالکل فنا

حکم یہی ہے مجھے اے اتفاق — ڈالتی ہوں اس لئے اُن میں نفاق

ہے مری تحقیر خلافِ ادب — میں ہوں فرستادۂ درگاہِ رب

سلسلہ تقریر کا جب بڑھ گیا — پھوٹ کو یہ غیب سے آئی صدا

ڈال دئے تو نے دلوں میں شگاف — کب تلک اے پھوٹ یہ لاف و گزاف

حد سے سوا بڑھ گئی تو شرم شرم — جھوٹ میں اور اتنا غلو شرم شرم

چیز حقیقت میں کوئی تو نہیں — تجھ میں حقیقت کی کہیں بو نہیں

چیز وہی چیز حقیقت میں ہے / تعبیہ جو خلق کی فطرت میں ہے

فطرتِ انساں کے ہے جو کچھ خلاف / ہیچ ہے وہ اس میں نہیں اختلاف

طبع بشر میں ہے ودیعت وفاق / واں نہیں مطبوع بجز اتفاق

روم ہوں یا ترک عجم یا عرب / مہر و محبت پہ ہیں مجبول سب

ایک کو ہے ایک کی جانب جھکاؤ / ایک سے ہے ایک کے دل کو لگاؤ

ہوتی کچھ اے پھوٹ اگر تیری اصل / متحد انسان کی ہوتی نہ نسل

تو وہ سرچشمہ نہیں جس میں ہو آب / تیری نمائش ہے برنگِ سراب

ایسے بہت کرتی ہیں جلوے عیاں / آدمِ خاکی کی غلط فہمیاں

جیسے کہ بے اصل حسب گاہ گاہ / ملک کرا دیتی ہے دم میں تباہ

تجھ سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر بگاڑ / رائی کے ہو جاتے ہیں بن کر پہاڑ

ہے یہ نمایش تری اے خود نما / شعبدہ اک وہمِ غلط کا کیا

سیکڑوں گھر جہل نے ڈھائے ہیں یہاں / پردے بہت عقلوں پہ ڈالے ہیں یہاں

جہل کا چھایا ہے اندھیرا جہاں / ملک کو ظلمت نے ہے گھیرا جہاں

ٹھیک نہیں سوجھتی واں کوئی چیز / نفع و ضرر میں نہیں ہوتی تمیز

قوم کی تعریف نہیں جانتے / اپنی حقیقت نہیں پہچانتے

کر نہیں سکتے وہ حقائق میں غور / کہتے ہیں جز اور ہے کُل ہے اور

جانتے دریا کو ہیں اک شے جدا / قطروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہے جدا

پر یہ عزیزوں کو نہیں سوجھتا / ہے انھیں قطروں سے وہ دریا بنا

بس یہی انساں کی غلط کاریاں — دیتی ہیں پہنچا اُسے اکثر زیاں
ہوتا ہے بیٹھا ہوا جس شاخ پر — تولنے لگتا ہے اُسی پر تبر
چلنے کو جس راہ میں ہوتا ہے وہ — کانٹے اُسی راہ میں بوتا ہے وہ
پینے کا جو اُس کے ہے جاں بخش جام — زہر ملاتا ہے اُسی میں وہ مدام
حق کبھی ہوتے نہیں ویسے عیاں — جہل کی چھائی ہوئی تاریکیاں
ہوتی ہے ختم شبِ تار جب — پھیلتے ہیں علم کے انوار جب
شے نہیں رہتی کوئی پیشِ نظر — نورِ حقائق کے سوا جلوہ گر
سچ نظر آتا ہے سچ اور جھوٹ جھوٹ — تفرقہ رہتا ہے نہ رہتی ہے کچھ پھوٹ
وہمِ دوئی دل میں سماتا نہیں — اپنے سوا کچھ نظر آتا نہیں
بھائیوں پر پہلے کئے تھے جو وار — اپنا بدن پاتے ہیں اُن سے فگار
اُن پہ چلائے تھے جو تیر و سناں — اپنے بدن پر ہیں اب اُن کے نشاں
اُن کے سمجھ کر جو بگاڑے تھے کام — کام بگڑتے ہیں وہ اپنے تمام

علم ہو جس قوم کا یہاں راہبر — برکتیں اللہ کی اُس قوم پر
جانتے ہیں وہ برکاتِ وفاق — اُن پہ ہے روشن خطراتِ نفاق
فرق نہیں اُن کے زن و مرد میں — قوم کی طاقت ہے ہر اک فرد میں
رتبہ یہ ایک نے ہے اُن کو دیا — لاکھوں کروڑوں پہ ہیں فرماں روا
زور سے ہیں اُن کے زبردست زیر — لومڑیاں سامنے اُن کے ہیں شیر

اے کہ تیری ذات ہے عالم پناہ — اے وہ واحد کُل کا ہے تو بادشاہ
جوڑنا ٹوٹوں کا تیرے ہاتھ ہے — تیری صفت جامع اشتات ہے
منتج ادبار ہے جب تک نفاق — مثمر اقبال ہے جب تک وفاق
تلخ ہے جب تک ثمر اختلاف — ہے تر و تازہ شجر ائتلاف
بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر — دیکھیو پھر ایک قوم کو شیر و شکر
ٹوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی — ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی
بند سے ہو بند نہ کوئی جدا — بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا
پھوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب — ایک سے ایک آن میں بچھڑ جائے جب
رکھنی ہے باقی تجھے گر اُن کی نسل — تفرقہ کر اُن کا تو مبدل بہ وصل
ورنہ اگر ہو نہ ملاپ اُن کو راس — اور نہ ہو سر جوڑنے کی اُن کے آس
وہ جئے تو کیا جئے بے آبرو — جلد اٹھا لے انہیں دنیا سے تو
پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا — حق یہ ہے اُس قوم کے بہتر فنا

مسلمانوں کی تعلیم

تحریر ۱۸۹۶ء

(یہ ترکیب بند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا تھا)

زمانہ دیر سے پلٹا رہا ہے پہلے مسلمانوں — کہ ہے گردش میں اب تیری غیب کی آواز آتی تو

سنتے ہوں گر نہ معنی لاتسبوا الدہر[1] کے تم نے — تو اب سن لو کہ ہوں میں شانِ رحمانی مجھے مانو

وہ ناصح اور ہونگے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے — اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو

مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو — خبر تم کو بھی ہے کچھ ہوئے مری چالوں سے بیگانو

گئے وہ دن کہ نفریں کرتے تھے دیندار دنیا پر — بقائے دین و ملت منحصر دنیا پہ اب جانو

گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے — بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو

گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یہاں عیش کرتے تھے — ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل میری جانو

مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں — یہ سودا کب تک اے شمع سحرگاہی کے پروانو

بھرا سمجھے ہو جس گھر کو نہیں دیّار وہاں کوئی — کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ

پھری ہیں وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری — جہاں ہیں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری

جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ اُن کو — کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں — نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری

جہاں علم تجارۃ میں نہ ماہر ہونگے سوداگر — تجارۃ کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری

نہ آئیگی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت — جنھیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری

---

[1] یہ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ یعنی زمانے کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ بھی ایک شان ہے شیون الٰہی میں سے اور زمانہ کے جو واقعات تم کو ناگوار گزرتے ہیں وہ درحقیقت خدا کے کام ہیں۔ ۱۲

اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی　　تو دینا ہوگا اُن کو امتحانِ علم بیطاری

نہ مستغنی رہا دل علم سے ہے اب نہ باورچی　　ہوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری

یقیں جانو کہ آئندہ کھلیں گی درسگاہوں میں　　گر آٹا پیسنے کو چاہیئے گی اک پسنہاری

کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز　　نہ فصادی نہ جراحی نہ کحالی نہ عطاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے

جو سچ پوچھو تو سچ علم ہے اور خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انساں کا اک زیور　　ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر

کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا　　نہ زرگر اور نہ آہنگر نہ بازی گر نہ سوداگر

مہندس چاہیئے مزدور اب اور راج اقلیدس　　بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور

نہ پہنچے گا کوئی جاہل کی شاید سی ہوئی جوتی　　بس اب سمجھے فلاطوں سے تو نہیں کچھ یہ ہوں تو ہوں کمتر

جہانداری میں آج ایک ایک عاقل ہے جم و کسریٰ　　جہانگیری میں ہے اک اک سپاہی طغرل و سنجر

گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انساں کے سارے　　برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر

یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا　　جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اُس سے اعلیٰ تر

کوئی دن میں خسارہ سب سے بڑھ کر اس کو سمجھیں گے　　کہ دو دن آدمی ٹھہرا رہے یہاں ایک حالت پر

نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں　　دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دونگا

کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دونگا

ہمارے شکر سے اے قوم احساں اُسکا بالا ہے　　کہ جس نے قوم کی تعلیم کا یہاں ڈول ڈالا ہے

نہیں تعلیم بے علموں کی کم احیائے موتیٰ سے — جہاں تک تجھ میں دم باقی ہے مُردوں کو جلاتا رہ
زباں ہیں تو نے گر اپنے پہ کھلوائی ہیں حق کہکر — تو خاموشی سے اپنی نکتہ چینوں کو تھکاتا رہ
فرو ہوتی نہیں آتش سے جب آتش بھڑکتی ہے — ہر اک شعلہ کو آبِ بُردباری سے بجھاتا رہ
کیا ہے زندہ قوموں کو سدا قوموں کے کشتوں نے — مہم گر فتح کرنی ہے تو چوٹیں دل پہ کھاتا رہ
شدائد میں تحمل خاص میراث انبیا کی ہے — جو تو آلِ محمدؐ ہے تو سب صدمے اٹھاتا رہ

کوئی دن اور اس دارالمحن میں رنج سہنا ہے
پھر اس کے بعد تجھ کو زندۂ جاوید رہنا ہے

عزیزو حق کی رحمت ہے یہ پیر ناتواں ہم میں — پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجواں ہم میں
ہزاروں ہم میں ہونگے بیچلر اور ماسٹر پیدا — مگر اے قوم پھر چھوڑیں پیدا کہاں ہم میں
ہمیشہ ہم میں یاں قوم کا ہمدرد یہ قدرت خدا کی ہے — نہیں رشتہ کوئی مدت سے باقی درمیاں ہم میں
ہمارے تفرقوں نے کر دئے تحلیل سب اجزا — نہ پاؤ گے کہیں ترکیبِ قومی کا نشاں ہم میں
ابھی اٹھکر فلاحِ قوم پر کوئی کمر باندھے — ہزاروں اس سے ہو جائینگے پیدا بدگماں ہم میں
ابھی سُن لیں کسی قومی جماعت میں شکر رنجی — ہزاروں ہونگے یہ بدفال سنکر شادماں ہم میں
بن آئے قوم کی خدمت تو کیونکر ہم سے بن آئے — نہ دور اندیشیاں ہم میں نہ خیر اندیشیاں ہم میں
اگر یہ چھیڑ اس ہیلی کی نہ سید ہم کو بتلاتا — تو اسلامی اخوت بھی فقط اک چیستاں ہم میں
نہ کی سید کے منصوبوں کی گر تائید یاروں نے — تو پھر ہرگز سنبھلنے کی نہیں تاب و تواں ہم میں

بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو
پہنچنے دو سلامت تا بمنزل کارواں یارو

رہو جیسے رہو قوم کے غمخوار یار ابتک ۔ کرو ڈھنڈلا نہ اُس رشتہ کو جو ہے بے غبار ابتک

جماعت کو تمھاری دیکھتے ہیں لوگ حیرت سے ۔ تمھارے دم سے ہے کچھ قوم کا باقی وقار ابتک

تمھاری کوشش اور ہمت کا چرچا ہے زمانہ میں ۔ تمھاری خدمتوں کی قوم ہے منت گزار ابتک

جو کام انجام کرنا ہے تو سید کے رہو حامی ۔ کہ قومی کامیابی کا اسی پر ہے مدار ابتک

وگرنہ دوستو سُن لو کہ ہے آپس کی اَن بَن کا ۔ وہی انجام جو ہوتا رہا ہے آشکار ابتک

پڑے ہیں جابجا بکھرے ہوئے اطراف عالم میں ۔ کھنڈر لاکھوں ہمارے تفرقوں کے یادگار ابتک

ہزاروں باغ ویراں ہو گئے آپس کے جھگڑوں میں ۔ پلٹ کر پھر نہیں آئی جہاں فصلِ بہار ابتک

سفینے غرق لاکھوں کر دئے بادِ مخالف نے ۔ زمانہ کو نہیں معلوم خود جن کا شمار ابتک

نہ سمجھو یہ کہ فارغ ہو گئے ہم خاک میں مل کر ۔ ہماری گھات میں ہے انقلابِ روزگار ابتک

نظر آتا نہیں یہاں حملۂ دوراں سے بچنے کو ۔ سوا اک درس گاہِ قوم کے کوئی حصار ابتک

کرو پورا حصارِ قوم کو سر جوڑ کر یارو

ہٹاؤ حملۂ دوراں کو سب جی توڑ کر یارو

یہ دار العلم سدِ راہ آسیبِ زماں ہوگا ۔ اسی دار الشفا میں بخت پیر اپنا جواں ہوگا

نہیں صورت اُبھرنے کی ہماری کوئی اس سے ۔ اگر ہوگا اسی گھر سے بلند اپنا نشاں ہوگا

کمی نے کر دیا ہے علم کی ہم کو سبک سب سے ۔ اسی پاسنگ سے ہوگا تو یہ پلہ گراں ہوگا

یہ بیت العلم روز افزوں ترقی کا ہے سر چشمہ ۔ اسی چشمہ سے دیکھو گے کہ اک دریا رواں ہوگا

اگر راس آ گئی آب و ہوا اس کھیت کی ہم کو ۔ تو جو اُٹھے گا پودا اس زمیں سے آسماں ہوگا

یقیں ہے ٹہنیاں پھیلیں گی طوبیٰ سے سوا اسکی ۔ ہمارے واسطے دنیا میں یہ باغِ جناں ہوگا

سلف پر فخر دیکھیں اور تاسف اپنی حالت پر — مگن اسلام کی اور قوم کی دل میں چبھن دیکھیں

نمازوں کی تقید دیکھیں اور روزوں کی پابندی

اجازت نیک کرداری کی اور بدکام کی بندی

کلب میں آکے گر احباب رنگ انجمن دیکھیں — تو زیب کرسی صدر اک مجسم فن دیکھیں

نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں — وہ بابا اور اسکے شاگردوں کو باہم ہم سخن دیکھیں

تاسف کرتے ہیں جو ہند کی نااتفاقی پر — کلب میں ہندوؤں کے آئیں وہ اور یونین دیکھیں

اگر باور نہ ہو اتحاد سنی اور شیعی کا — بہم شیر و شکر یہاں چار یار و پنجتن دیکھیں

نہ دیکھا ہو جنھوں نے پیار ہندو اور مسلماں میں — وہ آکر مسلم و ہندو کو یک جان و دو تن دیکھیں

مسیحی پوششیں دیکھیں مسلمانوں کے بچوں کی — مسیحی کو مسلمانی قبا زیب بدن دیکھیں

مجسم دیکھنی ہو شکل مہر مادری جن کو — وہ بچوں سے سلوک آکر ملڈ دیارسن دیکھیں

اگر ہو دیکھنی تقریر میں تصویر معنی کی — تو والٹس کا بوقت درس انداز سخن دیکھیں

اگر اسکول میں چاہیں کہ دیکھیں ہیڈ پوسٹ کو آکر — فرائض میں تمام اوقات اُس کے مرتہن دیکھیں

دم تدریس دیکھیں جکر و سلی کو اگر بیدل — نہ پیشانی پہ بل دیکھیں نہ ابرو میں شکن دیکھیں

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن — تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

اگر بو جعفر طوسی کو زندہ دیکھنا چاہیں — تو عباس ابن جعفر سا محیط علم و فن دیکھیں

سخن کوتاہ - دار العلم پر ہوں قوم کے نازاں — جو آکر اسکا ایک اک در مکنوں من و عن دیکھیں

پھر اُن کے بعد گر دیکھیں مربی اپنے بچوں کا — تو اک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پیر کہن دیکھیں

خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں ہر دکھ میں — اُسے جب آکے دیکھیں قوم کی دھن میں مگن دیکھیں

رہیں چپ کس طرح ہم باغباں کی مدح و تحسیں سے
جب ایسا حیرت افزا آنکھ سے اپنی چمن دیکھیں

نہ سمجھیں یہ کہ ہے اُسکو ہماری مدح کی پرواہ
اگر سید کا استحقاق اہلِ انجمن دیکھیں

محبت قوم سُنتا ہے درو دیوار سے تحسیں
جنھیں باور نہ آئے وہ محبّ قوم بن دیکھیں

ادا سید کا حق تو ہم سے ہو سکتا ہے کیا حالی
مگر ہاں ہم کو اپنا فرض کرنا تھا ادا حالی

جوانمردی کا کام

مرتبہ ۱۸۷۲ء

یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اُس کو اُردو میں باضافہ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔

تھا کسی ملک میں اِک دولتمند
حق نے تین اُس کو دیے تھے فرزند

دور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا
باپ بیٹوں کی جوانمردی کا

باپ ہوں جن کے مروّت والے
بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمت والے

ہو چکا عمر کا جب سرمایہ
ایک دن باپ کے جی میں آیا

گھر ہے تکرار کا یہ دولت و زر
مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر

جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم
آخر اِک روز ہے مرنا تسلیم

بس کہ تھا اُس کو بہت فکر مآل
ایک دن بیٹھ کے سب مال و منال

اِک گراں مایہ جواہر کے سوا
تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا

پھر کہا اُن سے کہ اے اہلِ ہنر
باپ کی جان فدا ہو تم پر

تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی　　یہ جواہر ہے امانت اُس کی
باپ نے اُن سے کہا جب یہ سخن　　پھر تو تینوں کو لگی اور ہی دُھن
کہ کوئی کار نمایاں کیجیے　　جس طرح ہو یہ جواہر لیجیے
اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے　　اُس کو یہ فکر سوا تھا سب سے
ایک دن اُس کا کوئی واقف کار　　کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص نہ پیار
رکھ گیا آ کے جوانمرد کے پاس　　ایک بھاری سی رقم بے وسواس
تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ　　نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ
کچھ بھی نیت میں گر آ جائے خلل　　تو یہ تھا عین خیانت کا محل
جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے　　وسوسے دل میں بہت سے آئے
مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری　　لی تھی جن ہاتھوں اُنھیں ہاتھوں دی
نفس سرکش کو کیا مات اُس نے　　دی رقم اور نہ دی بات اُس نے
صاحب زر نے جو کچھ نذر کیا　　وہ بھی اُس دل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو اُن کے دی جب یہ خبر　　ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر
اِک بُرائی سے بچے تم تو کیا　　اِس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز　　شرم کی جا ہے تری عمر دراز

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا　　میں جو دریا کی طرف جا نکلا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفلِ صغیر　　گر کے پانی میں چلا صورتِ تیر

تھا جہاں یار نہ کوئی یاور — ماں کا پہلو تھا نہ آغوشِ پدر
آنکھ تھی جانبِ مادر نگراں — ماں کنارے پہ اُدھر تھی حیراں
گرچہ تھا کام خطرناک بڑا — پر اسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی کچھ کو خبر — جا پڑا نام خدا کا لے کر
جان تو جا ہی چکی تھی اُس کی — پر مری شرم خدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا — لا کے بیٹے کو دیا ماں سے ملا
باپ نے بیٹوں سے یہ سب اُن سے کہا — کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا
آدمیت کا کیا تم نے کام — جا تو بس ہے یہی اس کا انعام
قوم کی جا پہ مری جاں کیا ہے — نہ ہوا اتنا بھی تو انسان کیا ہے

پسرِ خُرد کا اب سنئے بیاں — جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز — باپ سے ایسے کہ اے بندہ نواز
بات تو لائقِ اظہار نہیں — آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
جب اک روز گھٹا چھائی تھی — رات آدھی کے قریب آئی تھی
شبِ تاریک میں وہ ابرِ سیاہ — کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ
اک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا — خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا
ساتھ تھے نہ کوئی بھائی تھا — میں تھا اور عالمِ تنہائی تھا
کوندی اک سمت سے بجلی ناگاہ — جس سے آگے کو کھلی راہِ نگاہ

پڑی اک غار پہ وہاں میری نظر — جس کی صورت سے برستا تھا خطر
موت کھولے ہوئے تھی منہ گویا — جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک مرد غریب — جس کو روتے ہیں کھڑے اُس کے نصیب
جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی — یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی
جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش — غار کے منھ میں پڑا ہے مدہوش
اپنی ہستی کی نہیں اس کو خبر — اور قضا کھیل رہی ہے سر پر
اجل آجائے تو ہے روک نہ تھام — ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام
اتنے میں اور جو بجلی چمکی — شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی
مرد نکلا وہ شناسا میرا — تھا مگر خون کا پیاسا میرا
مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری — ایک مدت سے چلی آتی تھی
وان عداوت پہ گر آؤں اپنی — اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی
مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار — اک اشارہ میں وہ تھا لقمۂ غار
آگیا مجھ کو مگر خوفِ خدا — اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا
مرتے کو مارنا بے دردی سے — ہے بہت دور جوانمردی سے
حوصلہ کا ہے یہی وقت کہ آج — ہے عدو اپنی مدد کا محتاج
جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار — کہ اسے کیجے چل کر بیدار
وہاں سے جا اُس کو اٹھا لایا میں — موت کی زد سے بچا لایا میں
منھ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا — اس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

سن کے دی باپ نے بیٹے کو دعا
اور چھاتی سے لیا اس کو لگا

پھر بڑے بیٹوں کو بلوا کے کہا
بولو اب کس سے ہوا کام بڑا

داستاں جب یہ سنی دونوں نے
باپ سے عرض کی یہ دونوں نے

خانہ زادوں کی ہو تقصیر معاف
پوچھئے ہم سے تو ہے یہ انصاف

جس جواہر کے طلب گار تھے ہم
اس کے لائق تھے نہ حقدار تھے ہم

اور کو اس کی ہوس ناحق ہے
حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے

باپ یہ سن کے ہوا شاد بہت
ان کے انصاف کی دی داد بہت

چھوٹے بیٹے کو بلا کر پھر پاس
پہلے خالق کا کیا شکر و سپاس

پھر جواہر اسے دے کر یہ کہا
لو یہ ہو تم کو مبارک بیٹا

ترکیب بند موسوم بہ زمزمۂ قیصری

مرتبہ ۱۸۷۶ء

یہ ایک نظم انگریزی پوئم کے تین حصّوں میں سے اوّل حصّہ کا منظوم ترجمہ ہے
شاید مسٹر الیٹوک اِس کے مصنف ہیں جنھوں نے کرنل ڈیوس کے توسط سے
جبکہ وہ دلّی میں کمشنر تھے اِس تمام پوئم کو دلّی کے چند لائق آدمیوں سے
فارسی میں نظم کراکر ولایت میں بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ فارسی نظم لکھے
جانے سے پہلے صاحب کمشنر نے یہ پوئم اُردو میں ترجمہ کراکر نظم کرنے کے لئے
میرے پاس بھیجی تھی۔ میں اُن کے حکم سے صرف پہلے حصّہ کو اُردو میں نظم کرنے
پایا تھا کہ مصنّف نے فارسی میں نظم کرانا چاہا۔ میں نے بہ سبب علالت کے فارسی
نظم سرانجام کرنے سے اپنی معذوری بیان کی اور یہ کام اوروں کے سپرد
ہوگیا۔ اِس نظم کے تین حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں ہندوستان اور مسلمان
بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے۔

دوسرا اور تیسرے حصّہ میں تمام ہندوستانی رئیسوں کا جو دربارِ قیصری
میں شریک ہوئے تھے عموماً اور حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے۔ مصنّف نے

پہلے حصے میں بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اِس کو دیکھکر مجھ سے خوش یا ناراض نہوں۔ میرا صرف اِتنا قصور ہے کہ میں نے اُن خیالات کو ایک ایسی زبان میں نظم کر دیا ہے جس کو میرے ہموطن سمجھ سکتے ہیں۔ اس نظم میں جہاں کہیں ضرورت نے مجبور کیا اپنی طرف سے بھی کوئی بات اضافہ کر دی گئی ہے اور اکثر تمیز کے لئے اِس کو بریکٹ میں محدود کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ ممکن ہے کہ اِس کے علاوہ اور بھی کہیں کہیں کچھ اختلاف پایا جائے لیکن جو لوگ انگریزی پوٹیکل خیالات کو اُردو نظم میں بیان کرنے کی دقتوں سے بخوبی واقف ہیں اُن سے اُمید ہے کہ ایسی خفیف فرو گزاشتوں سے چشم پوشی فرمائینگے۔
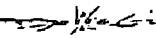
اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے اگر کہئے تجھے سارا جہاں

اک طرف کھینچی ہے قدرت نے تری دیوار کوہ
موجزن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بیکراں

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں

بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار
جبکہ اِس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ کچھ اندر کا فکر
دوستِ گلچیں نارسا و نخلِ دولت گلفشاں

تو نے فارغ کر دیا ہے فتحِ ملکِ غیر سے
پھر ضرورۃ کیا کہ کھولیں بے سبب تیر اور کماں

چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
ہو نہ اب کہنہ وخزاں سے رخنہ اندازِ بہار

اے مقدس آریہ ورتھ آئی کیا تجھ پر بلا — جس نے بزمِ یک دلی کو تیری برہم کر دیا
کوچ کر جاتا نہ تجھ سے گر وفاق اور اتحاد — کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا
تو کہاں اور اہلِ مغرب کے بھلا حملے کہاں — ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھ کو سزا
گر تری اولاد میں ہوتا سلوک و آشتی — لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگامِ وغا
گھاٹیوں میں آ کے جب ہوتی فراہم تیری فوج — ہوش کھو دیتی سُمِ اسپانِ ہندی کی صدا
بھاگنا بھی دشمنوں کو واں سے ہو جاتا محال — دیکھتے جب ہر طرف سے آمدِ سیلِ بلا

یا اطاعت کرتے اور لڑنے سے باز آتے وہیں
یا اگر کرتے بہت ہمت تو مر جاتے وہیں

ہند کا حق تھا کہ ہوتی مہر و الفت کی زمیں — قوم کے ہمدرد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں
حیف جس مٹی سے اگنا چاہئے تھا نخلِ مہر — جم گیا آب و ہوائے دہر سے واں تخمِ کیں
سر بسر تختے گلِ خودرو کے جس جنگل میں تھے — غور سے دیکھا تو پنہاں تھے درندے بھی وہیں
امن قائم تھا طلوعِ صبح کے آغاز میں[1] — جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا عزلت گزیں
دیوتا جو آریا کے زعم میں فانی نہ تھے — فانیوں کی طرح یہاں آ کر رہے وہ بالیقیں
جنگ و خونریزی کے خوگر ہو گئے وہ رہنما — ورنہ فتنہ کا قدم تک یہاں نہ آیا تھا کہیں

یک بیک آیا خلل امن و اماں میں ہر طرف
ایک تزلزل پڑ گیا ہندوستاں میں ہر طرف

مرحبا اے خطۂ ہندوستاں صد مرحبا — اس خرابی پر بھی رو کے تو نے حملے بارہا
جانتا ہے اک جہاں اسکندرِ اعظم کا نام — چشمۂ حیواں پہ جس کو لے گیا بختِ رسا

۱؎ یہ شعر اپنی طرف سے اس لئے بڑھا دیا گیا ہے تا کہ بند کے پورے سات شعر ہو جائیں ۱۲

تھا جہاں خوف اور سناٹا بشر کا سدِ راہ اور تحیر کے طلسموں میں خلل آیا نہ تھا
گہرے اور تاریک غاروں میں تھا اب زندگی سایۂ ہیبت تھا جن پر سر بسر چھایا ہوا
گو ہوئی اس کی رسائی چشمۂ حیواں تلک پر نہ ہرگز تیر سے سارے مرحلے طے کر سکا
جی میں جو حسرت تھی وہ آخر نہ نکلی زینہار دل میں جو ارمان تھا وہ دل کا دل ہی میں رہا

وقتوں نے فتح کی بے طرح گھبرایا اُسے
کام ہی مشکل تھا یا مشکل نظر آیا اُسے

جس جگہ ملتا ہے ستلج سے شبک رفتار بیاس رہ گئیں فوجیں ٹھٹک کر اُس کی وہاں ساحل کے پاس
بات سنتا تھا نہ کوئی کارواں سالار کی کارواں اور کارواں سالار کی ٹوٹی تھی آس
تھا کھڑا حیراں سکندر اور کہتا تھا کہ بس فتحِ ہند اک خواب تھا اور اُس کی تھی تعبیر یاس
جب سکندر پھر گیا ہو بیاس سے بے نیل مرام کون پھر ایسا ہے آئے یہ عزیمت جس کو راس
بعد مدت پھر وہیں آئی امنڈ کر ایک گھٹا[۵۱] بیاس کے میداں میں جس سے چھا گیا خوف و ہراس
جائے حیرت ہے کہ وہ کشور کشائے نامور[۵۲] پھر گیا لیکر جہاں سے اپنی فوجِ بے قیاس

کر سکے کچھ وہاں نہ اس حملے کے آگے اہلِ ہند
چھوڑ کر ندی بھری کشتیوں سے بھاگے اہلِ ہند

پہلے اس فتح نمایاں سے بھی اگر جنگجو کر گئے یہاں آ نکر تیغ آزمائی میں غلو
ندیاں جو راہ میں حائل تھیں اُنسے بار ہا حملہ آور اترے اور پڑتے رہے رن سو بسو

---

۵۱ اس سے مراد انگریزی فوج کا حملہ ہے جو ۱۸۴۶ء میں پنجاب پر ہوا۔

۵۲ یعنی سکندر اعظم۔

وہ نشاں جن کی چمک تھی بے بقا مثلِ شہاب[۵۱] گرچہ نظر آئے اٹک پر اور ستلج پر کبھو
رفتہ رفتہ سرزمینِ گنگ تک پہنچا مر اس آکے ٹھہرا پہلے مینندر[۵۲] کنارِ آبِ جو
دھار میں گنگا کے وہ ہتھیار چمکے سربسر ہند تک یونان سے جو جیتے آئے تھے لہو
ناگہاں جہلم پہ چمکی آن کر ستھیا[۵۳] کی آگ اور پھر کرتی رہی آہستہ آہستہ نمو

پہنچی جب گنگا کے لگ بھگ بیاس اور ستلج کو پھاند
ہوگئے یونان کے ہتھیار آگے اس کے ماند

---

۵۱ یعنی جن کے جھنڈوں کے پھریروں کی چمک شہابِ ثاقب کی طرح بے بقا اور ناپائدار تھی اور جو ہندوستان پر حملے کر کرکے محض ناکام یا چند روزہ شمالی ہند پر حکومت کرکے واپس چلے گئے ۔

۵۲ مینندر یونان کے سوتیر خاندان کا ایک مشہور بادشاہ ہے۔ یہ خاندان سکندرِ اعظم کے بعد ملک باختر یعنی خراسان وغیرہ میں غالباً حضرت عیسیٰؑ سے دو سو برس پہلے مسلط ہوگیا تھا۔ مینندر نے جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے ہندوستان پر ۱۸۰ء قبل مسیح کے درمیان حملے کئے ہیں۔ اس نے جنوب میں سندھ اور کچھ تک اور مشرق میں متھرا تک فتح کرلیا تھا۔

۵۳ بحرِ اسود اور کوہ قاف اور بحیرۂ کیسپین کے شمال میں جو وحشی قومیں آباد تھیں، قدیم زمانہ میں ان کو ستھیا والے کہتے تھے۔ اب وہ تمام ممالک یورپین روس اور ایشیائی روس میں شامل ہیں۔ ستھیا والوں کے حملے حضرت مسیح سے سو برس پہلے شروع ہوگئے تھے۔ ان وحشیوں کے غول کے غول ہندوستان پر چڑھ آتے تھے اور لوٹ مار کرکے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ حضرت مسیح کی ولادت سے چند سال بعد کشمیر کے قریب

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند جانب ہندوستاں محمود[۱۵] نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابرِ رحمت تھا مگر ہندوؤں کے دل رہے اسکے ستم سے درد مند
وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی وہاں آفت بپا اور چلتا تھا جلو میں اُس کے آسیب و گزند
غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کو بیم وہاں سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زود مند

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۱) ان کی زبردست سلطنت قائم ہو گئی تھی۔ ان کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ کنشکا ہے جس نے بودھ مذہب کی چوتھی کونسل منعقد کرائی۔ شمالی ایشیا میں جو بودھ مذہب کی شکل ہے وہ اسی کونسل کا نتیجہ ہے۔ سیتھیا کی آگ سے غالباً اُن کی جہانسوزی و تاخت و تاراج مراد ہے۔ جیسے کہ بایزید عثمانی کو ایلدرم کہا گیا ہے اور عرب کی فتوحات کو برق سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۱۵ انگریزی مؤرخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحمدلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضبناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے ہیں۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بیرحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک اور انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں جن کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

نظم

اے ملک زرنگار (یعنی ہندوستان) قدم ہے وہ کونسا حملے سے جسکے ہے ترے ارکاں میں زلزلہ
وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں
ٹھاکر اور انکے مندر، راجا اور ان کے تخت حملے سے اس کے آ گئے ہیں سب یہ وقت سخت
پتلا غضب کا کونسا وہ ہولناک ہے؟ اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے

روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری　　　صلح سے گجھتانہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند
خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پہ رحم　　　قتل و تاراج تھا اک بازی سلطان پسند

جب وہ آتا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یہاں سے تو مثل دشت ویراں تھا یہ ملک

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۲ -

آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں　　　بکھرے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں
کتے جو اس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار　　　ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر　　　مقتول رانیوں کے گلے سے اتار کر
کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ　　　اور بے گناہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگرچہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کاروائیاں گو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانہ میں کی گئی ہوں ہمیشہ باعث شرم و ندامت رہیں گی۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبہ سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ یورپ کی شائستہ قومیں جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی کا خطاب دیتی ہیں محمود کے زمانہ میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں تک ایشیا سے بمراتب زیادہ وحشت و خونریزی و بیرحمی میں مبتلا تھیں اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں نہ آئندہ بدلنے کی امید ہے۔ ایک طمع اور خودغرضی۔ دوسرے زبردست کا

آخر اے دانا حکیموں کچھ سبب اس کا بتاؤ — ہے بنی آدم کو قتل کیوں قتل بنی آدم کا چاؤ؟
جب کہ حق اور راستی ہے خاص رحمانی صفت — پھر تعجب ہے کہ جاری کا ہو اس میں لگاؤ
جب کہ ہے سر چشمۂ مہر و محبت ذاتِ حق — پھر شمائی جائے کیوں اس کی شریعت سے دباؤ
کیا یہ زیبا ہے کہ ہو دینِ حق کو لے اپنا جنس — زور سے منواؤ تم اور ندیاں خوں کی بہاؤ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۳) کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا جس طرح مگر مچھ مچھلیوں اور مینڈکوں کو یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل گائے کو نوشجان کرتا ہے اُسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں وہ ضعیف اور کمزور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگزر نہیں کرتے۔ سولہویں صدی کو جس میں اہل یورپ امریکہ میں جا کر آباد ہوئے کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا۔ اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہات سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کونسا ظلم اور کونسی بیرحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی میکسیکو اور پیرو جو کہ امریکہ کے دو شائستہ ملک تھے وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کیے اُن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملیگی۔ کورٹیز جو کہ ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا اُس نے اور اُس کے بعد نئے وارد ہونے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میکسیکو کو قاطبۃً ویران کر دیجیے اور وہاں ہسپانیہ کی ایک کولونی آباد کیجیے۔ چنانچہ جہاں تک اُن سے ہو سکا وہاں کے قدیم باشندوں کے نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شاہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کر کے اُلٹا لٹکا دیا اور اُس کی رعایا کو اُس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا۔ بڑے بڑے الاؤ لگے ہوئے تھے جن میں ہزارہا

یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے — اور اُن باتوں سے جن میں جلوہ الفت کا دکھاؤ
دل کرو اہلِ جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر — حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقین اُن پر دلاؤ

راہِ حق کا خار و خس سے پاک ہونا چاہیئے
گلشن دیں بے خس و خاشاک ہونا چاہیئے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۴)

بنی آدم عام طور پر بے تکلف جلائے جاتے تھے۔ معصوم بچوں کے روبرو اُن کی مائیں اور باپ بہ ہزار عقوبت و سختی آگ میں جھونک دیئے جاتے تھے۔ دیہات اور جنگلوں میں ہزاروں آدمی شکاری کتوں سے پھڑوا ڈالے جاتے تھے۔ یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنھوں نے کافروں یعنی مسلمانوں کو غرناطہ سے ایک ناپاک گنہگار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ ظالم اور بددین مسلمان اس لائق نہیں ہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہمسایہ اور ہم وطن ہو کر رہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریبًا ایک ملین بنی آدم اِن مقدس عیسائیوں کے ہات سے طرح طرح کی عقوبت اور سختی کے ساتھ مارے اور جلائے گئے۔ یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا۔ یہ مُلک جنوبی امریکہ میں بحرالکاہل کے کنارے پر واقع ہے۔ فرینسسلو پزیرو کہ غالبًا اٹلی کا رہنے والا ایک مجہول النسب آدمی تھا۔ اس کو جنوبی امریکہ میں فتوحات کرنے اور وہاں سے سونا چاندی رولنے کا مدت سے خیال تھا۔ اُس نے پناما یا اُس کے قریب کسی اور مقام میں ایک جماعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک بیڑا جہازوں کا اور کچھ سپاہ اُس کے ماتحت ملک پیرو کو جس کے تموّل کی بہت شہرت تھی روانہ کریں۔ چنانچہ اِس سامان کے ساتھ وہ وہاں پہنچا اور ایک دو پھیرے کے بعد اُس ملک

خار ہی خار آتے ہیں مدت سے لیکن یہاں نظر — خون ہے استاد[۱۵] اور شاگرد دونوں کا ہدر
راستی اور امن کی دیتے ہیں جو تعلیم یہاں — راحت اور آرام کو کھوتے ہیں اپنے سربسر
اور یہی چاہتے ہیں اس طرح تعلیم جو — وہ زمانے کے ستم لیتے ہیں اپنی جان پر
بات حیرت خیز ہے پر شک نہیں اس میں ذرا — نخل شادی آنسوؤں کی نم سے لاتا ہے ثمر

---

۱۵ استاد اور شاگرد کی شرح نیچے کے دو شعروں کی گئی ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۵) پر قابض ہو گیا۔ پھر تو کوئی ظلم تعدی ایسی نہ تھی جو پیرو کے
اصلی باشندوں پر جائز نہ رکھی گئی ہو۔ اُن سے سونا اور چاندی چھین چھین کر اپنے
ملک کو بھیجتا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا اُس کے ظلم و ستم سے ملک چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں
پر چڑھ گئے تھے جہاں وہ آخرکار فاقے کر کر کے مرجاتے تھے اور ہزاروں قتل کرائے
جاتے تھے۔ تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ ایسی بیرحمی کبھی دنیا میں نہیں ہوئی۔
انگریزوں کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر بہت سختی نہیں کی گئی۔ اگر یہ
بیان صحیح ہے تو وہاں سختی کی بہت ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بیچارے اس درجہ
ناہموار، بیڈول اور ناشائستہ تھے کہ انگریزی فاتحوں کی صورتیں ٹیپ ٹاپ
اور چمک دمک دیکھکر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے اور کسی طرح
ممکن نہ تھا کہ اُن کے پڑوس میں رہ سکیں جس قدر انگریزی مہاجروں کی تعداد
آسٹریلیا میں بڑھتی گئی وہ لوگ ملک کے اندرونی حصہ میں غائب ہوتے
گئے اور رفتہ رفتہ وہیں معدوم ہو گئے۔ اب شاذونادر کہیں کہیں اندرونی
پہاڑوں کے سلسلہ میں پائے جاتے ہیں۔ ٹسمانیہ کے قدیم باشندے جو ایک

دمبدم سیراب اگر خونِ شہیداں سے نہو
رہ نہیں سکتا ہرا دنیا کی راحت کا شجر

بے شہادت مِل نہیں سکتی حیاتِ سرمدی
موت ہے در زندگی کا اور دالم باب ظفر

غیر کے زخموں پہ ہرگز رحم ہم کھاتے نہیں
آپ جب تک زخم کاری کا مزا پاتے نہیں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۶) خوش بشرہ مگر ان سویلائزڈ قوم تھی یورپ والوں کی ہمسائیگی کے باعث بالکل فنا ہو گئی یہاں تک کہ اب ایک متنفس بھی اُن کی نسل کا باقی نہیں۔ پس آسٹریلیا کے قدیم باشندے جو انڈومان والوں سے بھی زیادہ بدقواز اور ناشائستہ تھے۔ انگریز جیسی اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم کے پڑوس میں کیونکر ٹھہر سکتے تھے ؎

تو بجلوہ چوں درآئی اجل از سر ترحم
ہمہ جا کند منادی پئے احتراز کردن

اگر فی الواقع انگریزوں نے آسٹریلیا والوں پر سختی نہیں کی تو یہ اُن کی عین دانائی تھی کہ اُنھوں نے مفت کی بدنامی نہیں لی اور تمام برّاعظم اِن کے لئے خود بخود خس و خاشاک سے پاک ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ نے علم و ہنر میں اِس قدر ترقی کی ہے اور وہ دوسرے حصہ کے ابنائے جنس سے اِس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اگلے زمانہ کے فاتح اور کشور کشا جن ناجائز ذریعوں سے مفتوحین کی دولت و ثروت اور سلطنت کے مالک ہوتے تھے اُن ذریعوں کے کام میں لانے کی اب مطلق ضرورت نہیں رہی جس قدر مال و دولت پہلے

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہ نامدار　　　صلح کل جس کی زمانہ میں رہیگی یادگار
بسکہ آزادی نئی نوع بشر کو تو نے دی　　　رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدہ کا مدار
فہم سے بندوں کے بالاتر تھے جو اسرار دین　　　بحث کرنے کا ملا بندوں کو ان میں اختیار
حوصلہ نکلا ترا شاہان پیشیں سے وسیع　　　تجھ سے القاب شہنشاہی نے پایا اعتبار

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۷) قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سے اضعاف مضاعف اب صنعت و تجارت کے ذریعہ سے خود بخود کھچا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایسی گورنمنٹوں کے درمیان جن میں سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو تجارتی عہدنامہ تحریر ہو جاتا ہے تو یہ یقیناً سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے ہلدی لگے یا پھٹکری، دوسری گورنمنٹ کے تمام ملک و دولت و منافع و محاصل کی بالکل مالک ہو گئی کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔ ابیات

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن　　　حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں　　　یہ گلچینی ہے یا کٹس ہے گلچیں ایا ہے قزاقی

شاید ان شعروں میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جو نتیجہ اگلے زمانہ کے غارتگروں کی لوٹ کھسوٹ سے مترتب ہوتا تھا اسی نتیجہ کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔ کروڑوں اہل صنعت و حرفت جن کی دستکاری مکینکس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ فلاحت پیشہ لوگوں پر یہ بپتا پڑتی ہے کہ زمین کی پیداوار جس قدر کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے اسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت

برتری اولاد کی پیروی تیری حقیقت ہوگیا اُن کا تعصب خود گلے کا اُن کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا اُن کے تعصب کا انھیں کر گیا رحلت جہاں سے جلد اُن کا اقتدار

خار و خس کے ڈھیر ہیں کھنڈروں میں اُن کے آج وہاں
دولت روئے زمیں کل جلوہ آرا تھی جہاں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۸) لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔ یہ پولٹیکل اکونمی کا مسلّم مسئلہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی جس قدر زیادہ مانگ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے بہم پہنچانے میں زیادہ لاگت اور زیادہ محنت صرف ہوتی ہے اور مصنوعی چیزوں کی جس قدر زیادہ طلب ہوتی ہے اسی قدر اُن پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔ ملکی تاجروں کے لئے جو کہ شائستہ ملکوں کی مصنوعی تجارت کرتے ہیں۔ اول تو اوپر والے منافع کی کچھ گنجائش ہی نہیں چھوڑتے اور اگر قدر قلیل (جیسے آٹے میں نمک) کچھ فائدہ ہوتا بھی ہے تو اپنے ملک کی نہایت ضروری اور ناگزیر اشیا کا نرخ گراں ہونے کے سبب اُن کی کمائی میں سے بہت کم پس انداز ہوتا ہے اور جس قدر ہوتا ہے وہ غیر ملکوں کی آرائشی اور غیر ضروری چیزوں کے خریدنے میں جو باوجود کمال نفاست اور لطافت کے نہایت ارزاں دستیاب ہوتی ہیں، صرف ہو جاتا ہے پس اِن کو بھی فارغ البالی اور آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اگر سو دوسو میں دو چار ایسے نکل بھی آتے ہیں جو اپنے ملک میں مرفہ الحال سمجھے جاتے ہیں، اُن کا معاملہ اور لین دین اُن کروڑپتیوں سے ہوتا ہے جن کے مقابلے

خیر اُن کے ذکر سے اب کیجیے قطع نظر خوبیاں تھیں عہد میں اُن کے نہ لیکن اسقدر
امن راحت اتفاق اور برکتیں انصاف کی ملک افزائش سے ہو جنکی بدولت بہرہ ور
اور رعیت کی اطاعت جو نہ مجبوری سے ہو ملک جس سے رغبت اور اخلاص سے خود جلوہ گر
نعمتیں ہندوستاں کو یہ ہوئیں اُس دم نصیب چھا رہی تھی جبکہ مایوسی دلوں پر سر بسر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۹) میں وہ اپنے تئیں محض مفلس اور قلاش تصور کرتے ہیں اور جن کی مانگ سے ہمیشہ دوالہ نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طمع اور خودغرضی اور زبردستوں کا زیردستوں کو لُٹنا اور پیسنا جیسا تاریکی اور وحشت کے زمانے میں تھا اُسی کے قریب قریب اب بھی ہے۔ صرف اِتنا فرق ہے کہ دولت گھسیٹنے کے لئے پہلے جبر و تعدی کی ضرورت تھی، اب اس کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔ اَن سویلائزڈ دنیا کی دولت سویلائزڈ دنیا کی طرف خود بخود کھنچی چلی جاتی ہے۔ تمثیل ایک اژدہا شیر کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ تو کیسا بیرحم ہے کہ ہمیشہ جانداروں کا خون پینے کی فکر میں رہتا ہے اور شکار کی دُھن میں دُور دُور کے دھاوے کرتا ہے۔ تمام جنگلوں میں تیری دھاک ہے۔ آج اِس ہرن کو پھاڑ ڈالا کل اُس پاڑھے کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ ایسی خونخواری پر کمر باندھنی اچھی نہیں ہے۔ شیر نے کہا کہ قبلہ! اگر میری سانس میں ایسی کشش ہوتی کہ دُور دُور سے جانور خود گھسٹتے ہوئے میرے مونھ میں چلے آتے اور میری حرص و آز کی آگ کو بُجھا دیتے تو میں بھی ہرگز کسی بے گناہ کے خون میں اپنے ہات رنگین نہ کرتا۔"

امن و راحت کا تصور تک نہ آیا تھا کبھی ‏ ‏ ‏ ‏ جانے حق ناحق کا سکہ چل رہا تھا بے خطر
دیکھ کر اخسر بدی کا دور دورہ بیکساں ‏ ‏ ‏ ‏ ہو چکی تھیں یہاں سے رخصت آہ ٹھنڈی کھینچکر

اُس اندھیرے میں اُجالا نا گہاں پیدا ہوا
چشمۂ حیواں کا ظلمت میں نشاں پیدا ہوا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۰) مع ذالک اگر کہیں آزادی تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے۔ اور بغیر جبر و تعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ درجہ کی شائستہ قوم سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آزادی تجارۃ کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے۔ حالانکہ آجتک پولٹیکل اکونمی نے اسبات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ کا قاعدہ مطلقاً قرین انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلاف انصاف بھی ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے فرانس اور یونائٹیڈ اسٹیٹس اس کو اپنے حق میں بالفعل مضر سمجھتے ہیں اس لیئے وہ اس کو جائز نہیں رکھتے لیکن انصاف شرط ہے۔ جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دنیا کی دولت گھسیٹی جاتی ہے اُن پر بخلاف اگلے زمانہ کے جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مشہور ہے کہ حکیم علوی خاں کے زمانہ میں جو کہ محمد شاہ کا معالج اور ایک نہایت حاذق طبیب تھا ایک عطار بھی اس کے نسخے دیکھ دیکھ کر علاج کرنے لگا تھا لوگوں نے اُس کا ذکر علوی خاں کے سامنے پیش کیا اور یہ کہا کہ جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے ہیں اور مرتے ہیں اُسی کے قریب قریب اُس کے علاج سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں علوی خاں نے کہا ہلے۔ لاکن من بقاعدہ می کشم

کیا مرہٹے کیا مغل سادات کیا افغان کیا — عہد میں سب کے رہی یہاں بارش ابر بلا

علم و فن جرأت نکوئی مٹ گئیں سب خوبیاں — دمبدم طوفان بدی اور عیب کا بڑھتا رہا

یاس سے حالت عجب اک ہند پر طاری ہوئی — بحر بے پایاں میں گویا سخت طوفاں تھا بپا

ناخداؤں کے بجا تھے اور نہ ملاحوں کے ہوش — اور تھا از عاقبت تدبیر کے بس کا نہ تھا

بے طرح چھایا ہوا تھا ابر ظلمت چار سو — کوکب رہبر کا ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا پتا

کوندنا بجلی کا تھا گویا کہ جگنو کی چمک — اک جھلک آئی نظر اور پھر اندھیرا چھا گیا

جو کہ بزدل تھے وہ غش کھا کھا کے گرتے تھے وہاں

اور جو چھوڑے ہوئے تھا ہر جری اور سورماں

ڈوبنے کے جب نظر آنے لگے آثار سے — تب نجات آئی یہاں ساتوں سمندر پار سے

آکے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کہ بس — باز رہ اے فتنہ اپنی گرمیِ رفتار سے

مدتوں کی سختیوں سے اک چھڑایا یک قلم — ہند کو اپنوں[۱۵] نے دی آکر نجات اغیار سے

اہل ہند اور اہل مغرب اصل میں سب ایک تھے — کچھ دنوں بچھڑے رہے پر گردشِ ادوار سے

گو رہے چندے جدا پر مل گئے انجام کو — کلفتیں بدلی گئیں فرقت کی آخر پیار سے

اہل مغرب کو نہ سمجھیں غیر ہرگز اہل ہند — (آئینہ اور سنگ دونوں نکلے ہیں کہسار سے)

اب نہ چھوڑیگا یقیں وہموں کی اڑ کاٹے بغیر

دوستی رہتی ہے کب نفرت کی جڑ کاٹے بغیر

---

۱۵ اپنوں سے مراد مغربی آریہ یعنی انگریز اور اغیار سے مراد مسلمان ہیں۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۱ واں قرم ساق بے قاعدہ می کشد ۱۲ حالی

دہریوں کا فرقہ لاالعقل و کوتاہ بیں ق | اپنی گمراہی سے جو تقدیر کا قائل نہیں
اب ہیولیٰ کو نہ سمجھے مصدر کل کائنات | اتفاق دہر پر رکھے نہ بنیاد یقیں
ورنہ ہم پوچھینگے اس سے کس طرح از اتفاق | یا ہیولیٰ سے گیا مغرب سے تا مشرق زمیں
کچھ جہاز اور چند سوداگر تجارت کے لئے | تا کہ ہوں پردیسیوں کی طرح واں جاگزیں
اور پھر اس کشور آباد پر قابض ہوں وہ | ایک مدت تک رہا مسلموں کے جو زیر نگیں

کیا یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا اے اہل رائے
یا مشیت نے تماشے اپنی قدرت کے دکھائے

ایسے ہذیانات بیجا سے یہ بہتر ہے کہ ہم | مان لیں امر[۱] اور اسر کی داستاں بے شک و وہم
گو کہ افسانہ ہے لیکن دہریوں کے قول سے | اس میں کچھ باتیں زیادہ دلنشیں پاتے ہیں ہم

---

[۱] امر دیوتا اور اسر راکشس کو کہتے ہیں۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ اگلے زمانہ میں ایک بار دیوتاؤں اور راکشسوں کی لڑائی ہوئی تھی جس میں دیوتا فتحیاب ہوئے اور راکشس ہارے راکشسوں کو یہ خیال ہوا کہ ہم باوجودیکہ دیوتاؤں سے قوی اور زبردست ہیں پھر کیوں ایسے مغلوب ہو گئے۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ اُن کے پاس علم یعنی منتر کی طاقت ہے۔ راکشسوں نے اُن کے منتر اور کتابیں چرا لیں اور ایک راکشس سنکھاسر نامی اُن سب کو لے کر سمندر میں غائب ہو گیا۔ ایشر نے جو یہ حال دیکھا آپ خود مچھلی کا روپ بھر سنکھاسر کو سمندر میں جا کر ہلاک کر دیا اور دیوتاؤں کے سارے منتر اور پستکیں صاف نکال لائے۔ ایشر جی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندر میں اور بھی بہت سے رتن یعنی مفید اور نایاب چیزیں ہیں اُن کو

اہلِ انگلستان کا آنا سمندر پار سے — ہے سمندر کا بلوتا فی المثل اے محترم
زندگی جو اُس سے اہلِ ہند کو حاصل ہوئی — ہے وہ امرت جو کہ پہنچا ہے سمندر سے بہم
اب رہا وہ زہر جس سے حلق شیو کا جل گیا — یہ وہی حق ہے کہ جو ہے واسطے باطل کے سم
جس سے ہوگی محو اگلے دیوتاؤں کی نمود — اور ہوں گے ہاتفانِ غیب گونگے یک قلم
جو مٹائے جائیگا باطل کی ظلمت کے نشاں
صبح صادق کی نہ ہوگی روشنی جب تک عیاں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۳) نکالنا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ میں کچھ اٹھتا ہوں میری پیٹھ پر رئی کی جگہ ہمالیہ پربت کو رکھدینا اور رسّہ کی جگہ باسکی (سانپ کا نام ہے) کو ہمالیہ کے گرد لپیٹ کر اُس کے دونوں سرے سُر اور اسُر اِس طرح سے پکڑیں کہ سانپ کے منہ کی طرف سے سُروں کے اور دُم کی طرف سے اسُروں کے ہات میں رہے اور اِس طرح سمندر کو بلو ڈالیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ سمندر میں سے چودہ رتن یعنی لچھمی۔ جواہر۔ شراب۔ دھنتر بید۔ چاند گئو۔ گھوڑا۔ سفید ہاتھی۔ تیر کمان۔ امرت۔ بس وغیرہ برآمد ہوئے۔ امرت پر سروں کی باہم تکرار ہوگئی۔ انھوں نے کہا ہم لیں۔ اُنھوں نے کہا ہم لیں۔ ایشر ایک حسین عورت کا روپ بھر کر ان پر ظاہر ہوئے دیوتا اور راکشس دونوں اس کی صورت پر فریفتہ ہوگئے اور آپس میں یہ بات قرار دی کہ یہ عورت جس کو جو کچھ دے وہ اُس کو خوشی سے لے لے۔ چنانچہ اُس عورت یعنی ایشر نے ایک لچھمی تو اپنے واسطے رکھ لی اور باقی تمام رتن دونوں فریق میں تقسیم کردیئے۔ امرت سُروں کے حصہ میں آیا تھا مگر تھوڑا سا تقسیم ہونا باقی

ہند میں پہلے کبھی جو سلطنت یکسو نہ تھی
اِس کو امر اتفاقی جانتا ہے اجہی

یہ بھی کہنا غیر ممکن ہے کہ تھی اسلاف میں
تجربہ کی عقل کی تدبیر و جرأت کی کمی

ہاں مگر تقدیر پر ہے جیب کہ ہر شئے کا مدار
چاہیئے کہنا کہ تقدیر الٰہی تھی یہی

اکبر اور شاہجہاں کی ذات میں کیا کچھ نہ تھا
سلطنت کی جو لیاقت چاہیئے وہ اُن میں تھی

وہ کہ نادر شاہ کی بھی کم نہ تھی شیر دلی کچھ
فتح اُن کی پر نہ اپنی حد سے آگے بڑھ سکی

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۴) تھا کہ ایک راکشس اٹھا کر لے گیا۔ دیوتاؤں میں سے ایک نے اُس کا سر اُڑا دیا۔ لیکن بس کو کسی نے لینا قبول نہیں کیا شیو یعنی مہادیو جی نے کہا لاؤ اِس کو میں کھا جاؤں۔ وہ اُس کو کھا تو نہ سکے مگر اپنے کنٹھ یعنی حلق میں رکھ لیا جس کے سبب سے اُن کا گلا نیلا پڑ گیا۔ شاعر اِس بند میں قصہ مذکور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برٹش حکومت کا ہندوستان میں قائم ہونا اِس قصہ کا مصداق ہے گویا انگریز مثل دیوتاؤں کے ہیں جو اپنے علم کی طاقت سے راکشسوں یعنی ہندوستان کے لٹیروں اور پنڈاروں اور ظالم حکمرانوں پر غالب آگئے اور وہ انگلستان سے کئی سمندر طے کر کے ہندوستان تک پہنچے یہ گویا سمندر کا بلونا تھا اور اُن کی سلطنت سے جو زندگی یعنی امن و رفاہ و آزادی اور جان و مال کی حفاظت ہندوستان کو حاصل ہوئی یہ وہ امرت ہے جو سمندر سے برآمد ہوا۔ اور جس زہر سے کہ مہادیو جی کا حلق جل گیا یا نیلا پڑ گیا تھا اُس سے خود انگریزی سلطنت کو مثال دی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح حق باطل کیواسطے زہر ہے۔ اُسی طرح یہ سلطنت قدیم سلطنتوں اور اُن کی طرز حکومت کے حق میں زہر ہلاہل کا حکم

آج یہ صوبہ پھر اک کل ملک وہ باغی ہوا — عہد میں سب کے یہی نقشہ یہی صورت رہی

دور تھا وہ دن کہ سر ہوں ایک در پہ سب کے خم
ہند کی قومیں ہوں ساری زیر سلطانی علم

راج پر راجہ اشوکا کے ہیں وہ لاٹھیں گواہ — جن پہ فرمان اُس کے اب تک ثبت ہیں جیسے اشتہا
ہند میں اڑیسہ کی لاٹھیں گواہی ہیں دور دور — ہے ہویدا اِن سے اس کی وسعت ملکیں و جاہ
پرنشان فتح جو اول پلاسی میں گڑا — اور پھر کابل میں پہنچی جہاں تک اُس کی کلاہ
مدتیں گزریں کہ وہ اٹک سے لیکر تا دکن — کر چکا ہے حد سے اِن لاٹھوں کی بڑھ کر قطع راہ
پورب اور پچھم میں بھی ڈالا ہے اُس نے دور دور — سایۂ عدل و نکوئی پر تو امن و رفاہ
ہم نے یہ مانا کہ پتھر پر ہیں جو کندہ حروف — وہ رہیں گے منتقش اُس پر ہزاروں سال ہا

نام ہے وکٹوریہ کا اُن سے بڑھ کر پایدار
نقش ہر اک صفحۂ دل پر ہے جس کا استوار

مشرق تاج آج تک تھا پیش زیب وطن — اک امانت جس سے محروم تھا فرق ہر دو زن
قبضۂ تقدیر میں اب تک رہا محفوظ وہ — مر گئے اُس کی تمنا میں سلاطین زمن
ہاں مگر اے فخر شاہان جہاں وکٹوریا — تھی ترے فرق مبارک سے الگ اُس کی لگن

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۵) رکھتی ہے اِس سے اگلے دیوتاؤں یعنی قدیم بادشاہوں کی حکمرانی کے طریقے اور قاعدہ سب محو ہو جائینگے اور اُن کی تائید میں جو غیب سے آوازیں آتی تھیں وہ بند ہو جائیں گی اور جب تک کہ ہندوستان میں صبح صادق علم اور شائستگی کی روشنی نمودار نہ ہوگی برابر قدیم زمانہ کی تاریکیوں کو یہ سلطنت محو کرتی رہیگی ۱۲ حالی

گر کہے کوئی کہ اوروں نے نہ کیوں پایا یہ تاج — اُس سے کہہ دو لائقِ جلوہ نہیں ہے ہر مرد و زن
گو بہت دنیا میں شاہ و شاہ بانو ہیں مگر — بانوئے برطانیہ کا سب سے بالا ہے چلن
ماں کسی اولاد کو ایسی نہیں ہوگی نصیب — اور نہ ماں کو ایسی بیٹی اور نہ دولہا کو دلہن

نیک نیت پاک دل ایسے بشر ہوتے نہیں
رنج سہنے کے لئے ایسے جگر ہوتے نہیں

وہ جزیرہ جو کہ روئے بحر پر ہے مثلِ خال — دھوپ کا اور روشنی کا جس کی سرحد ہے کمال
جس سے آگے بڑھ گئے ہیں آثارِ قدرت ناپدید — کچھ نہیں آتا نظر جز ذاتِ ربِّ ذوالجلال
یعنی انگلستان ہے جس کی حقیقت اس قدر — شاید اس کے باب میں کوئی یہ کر بیٹھے سوال
کیا ضرورت ہے کہ وہ مختار اور حاکم رہے — سرزمینِ ہند پر ہے جس کی وسعت کا یہ حال
اُس سے کہہ دو خون ہے اولاد کا اُس کی بہا — آب باراں کی طرح۔ اور بکثرت بہہ گئے ہیں لال
جس کے لینے اور بچانے کے لئے لاکھوں شجاع — جنگ میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہوئے ہوں پائمال

مفت اپنے ہاتھوں سے کھو دینا روا ہو کس طرح
خوں بہا اُن سورماؤں کا ادا ہو کس طرح

اور سب جانے دو کیا عظمت کی کچھ قیمت نہیں — یا فتوحاتِ نمایاں لائقِ وقعت نہیں؟
پے بہ پے فتح و ظفر کی قیمتی زنجیر کیا — دوش پر ایک قوم کے پیرایۂ عزت نہیں؟
واسطے اولاد کے میراث جس کو چھوڑ جائیں — اس قدر بھی دولتِ عزت میں کیا برکت نہیں
سچ ہے اس دولت کو جو ناچیز اُس کی روح کو — جسمِ خاکی سے جو سچ پوچھو تو کچھ سبقت نہیں
بحث کرنی اُس سے لاحاصل ہے کہہ دو اُسے — تجھ کو انگلستان کی شہرت سے کچھ نسبت نہیں

ناحق ایسے شخص سے کہنے کا تم مانو بُرا — جس کی فطرت میں کہ حیوانوں سے کم خصلت نہیں

ننگ ذلت ہے نہ کچھ پروا اسے عزت ہے جسے

ہر مذلت اور پستی پر قناعت ہے جسے

جرأتیں اسپارٹا سے یہ نہ ہوتیں آشکار — گر بزرگوں کی نہیں وہاں ہوتیں یادگار

جب بڑوں کے اپنے ساکے یاد آتے تھے انہیں — آبرو پر جان و تن بڑھ بڑھ کے کرتے تھے نثار

سورماں تھرموپلی کا نام سن پاتے ہیں جب — جوش میں آتے ہیں کیا کیا اُن کے دل اچھلتا

آئے ہیں اس معرکہ میں کام جو شیرِ جری — نسل میں اُن کی وہی عزت رہے گی برقرار

جو کہ دہلی یا اسائی میں ہوئے ہیں فتحیاب ق — ہموطن بھائی ہوں اُن کے یا عزیز و رشتہ دار

جی چرائیں گے نہ مر کر جان دینے سے کہیں — فی المثل گر دشمن کی طاقت سے بھی ہونگے دوچار

تاکہ فتح دہلی و فتح اسائی کا شرف

قوم میں باقی رہے گو اپنی جانیں ہوں تلف

یاد ہوگا سب کو وہ حق کا عتاب اولیں — جس نے ڈالی تھی بشر کی ذات میں بنیادِ کیں

تفرقہ نے توڑ کر پھینکا تھا سب کو دور دور — تھی پڑی جس وقت بن بولی کے تپتی ساری زمیں

کون ہوگا جس کے دل میں یہ تمنا ہو کہ پھر — ہو وہی پہلا عتاب انسان پر نازل کہیں

قومیں آپس میں بہت رکھتی ہیں یہاں جو میل جول — اُن کی نسلیں ہوتی جاتی ہیں زیادہ دور بیں

ایک حاکم کی رعیت دوست ہوتی ہے سدا — گر نہ ہو تو ایک دن ہو جائے گی وہ بالیقیں

قوت اور امن و خوشی ہیں ثمرہ ہائے اتفاق — ثمرۂ نا اتفاقی غیر ہزیمت کچھ نہیں

نوعِ انساں میں بدی سے جو کہ پھیلا تھا نفاق

کرتا جاتا ہے زمانہ اُس میں پیدا اتفاق

ہے زبردستوں کا یارا و بول بالا آج کل — پودنے[۱] کی اصل کیا دیوؤں کا ہو جس جا عمل

اک ذرا سی ٹھیس میں ہوتا ہے کام اُسکا تمام — دیو کی جنبش ہے اس کے حق میں پیغامِ اجل

ویسے گر انگلستان کا ساری رعیت ملکے ساتھ — تنگ ہو جائے عدو پہ عرصۂ جنگ و جدل

ورنہ وہ ملت کہ جو دو برّ اعظم پر ہے آج — سایہ افگن صورتِ ظلِّ ہما و فی المثل

کیا تعجب ہے کہ اُس کا سایۂ دور و دراز — رفتہ رفتہ جائے باہر اپنی سرحد سے نکل

سامنے اُس قوم کے انگلستان کی ہے وہ مثال — جیسے اک بالشتیا آجائے پیشِ مردِ یل

وقت پر سب مل کے گر اسکا نہ دینگے ساتھ یہاں
اک طرف ہو جائے گا پلّہ ترازو کا گراں

نوعِ انساں کو ملی ہے جب کہ عقلِ ناتمام — پھر حماقت ہے کہ کیجئے آج کل کا اہتمام

بات جو کل ہو چکی اُس کی بھی حسرت ہے عبث — رہتے ہیں آج اس لیے ہر حال میں ہم شادکام

جب کہ اک ہموار رستے پر چلے جاتے ہیں ہم — دائیں بائیں کے بلند و پست سے کیا ہم کو کام

کچھ دنوں سے چڑھ رہے ہیں ہم بلندی کی طرف — کر چکے ہیں قطع تھے یہاں پُرخطر جتنے مقام

آن پہنچے جب بلندی پر تو لازم ہے کہ اب — خوف کا ہرگز رہے باقی نہ دل میں اپنے نام

جب بلندی پر سے دیکھیں جھک کے پستی کی طرف — شکرِ حق لائیں بجا اور بخت کو بھیجیں سلام

جو خوشی دی ہے خدا نے اُس سے جی ٹھنڈا کریں
یادِ غمہائے گذشتہ سے نہ دل میلا کریں

---

[۱] یہ روس کی طرف اشارہ ہے۔ انگلینڈ کو پودنے اور روس کو دیو سے تشبیہ دی ہے۔

رنگتیں اب وقت کی ہم پھیرتے ہیں برملا | جس سے ظاہر ہو کہ حالت ہند کی ہے آج کیا
اتفاق اور دوستی نے کر دیا ہے سب کو ایک | اور آزادی نے[1] کر رکھا ہے ہر ایک کو جدا
مملکت فوجوں سے اور قلعوں سے ہے معمور سب | پایۂ نظم و نسق پہنچا ہے تا فوق السما
سر پہ دو تاج ہمایوں ہند کے رکھے گئے | واجبی حق الشرف مدت کے بعد اس کو ملا
برخلاف اس ملک کے[2] جو ڈھک رہا ہے برف سے ق | ہر طرف سے بن ہی بن اور قحط ہے جاندار کا
بھیڑیوں کے غول پھرتے ہیں ہوا میں جھپٹ کے | تاکہ جو مل جائے وہاں آوارۂ وحشت بلا

گر سکے چھوڑیں اُس کو ایسا بے کس و بے خانماں
حشر تک پیارے رہیں فرقت میں اُسکی نوحہ خواں

پارسائی ہند کی حالت نہیں زار و نزار | ہے موافق اُس کی وسعت کے رعیت کا شمار
فرض کیجئے کل بنی آدم کے حصے اگر | ایک حصہ اُس میں اہل ہند پائیں گے قرار
ہے یقیں مقدار اُس کی اس سے کچھ بڑھ جائے گی | کیونکہ فتنہ کو نہیں مدت سے ملتا یہاں بار
زندگی کی ریت اب ٹھہری کی شیشے میں ہوا | بیشتر جس کے نکلنے کا بندھا رہتا تھا تار
اس قدر بندوں کی روزی کا نہیں کیوں فکر ہو | ہے خدا کے حکم پر سب کی معیشت کا مدار

---

[1] یعنی سب کو رائے کی آزادی حاصل ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے اور خود گورنمنٹ کے خلاف رائے دینے کا مجاز ہے۔ گویا آزادی کی حیثیت سے سب جدا جدا ہیں اور اتفاق کی حیثیت سے سب ایک ہیں۔ ۱۲

[2] یہ روس کے ویران اور غیر آباد ملک کی طرف اشارہ ہے۔

کچھ نہیں تو قحط[1] کا دورہ سلامت چاہئے — بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار

یاد رکھ اے منکر حق ہے یقین اصل نجات

وسوسوں سے اور کھل جاتی ہے راہ مشکلات

ہر کرن سورج کی اور ہر بوند پانی کی ہے یہاں — لاکھوں جانداروں کے رہنے کو محلہ اک جہاں

وہ خدا جس نے بنایا اور جس نے پالا انھیں — کیا تجھے اور نسل کو تیری نہ دیگا قوت و ناں

ہند کا دریا جو چڑھتا ہے تو چڑھنے دو اسے — تو یقیں کو اپنے رکھ مضبوط بے وہم و گماں

---

[1] اس خیال سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک غریب ہندوستانیوں کی جانیں حشرات دمن و حشرات الارض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ کاش وہ ہندوستان کی آبادی گھٹنے کے لئے یہ امید ظاہر کرتا کہ جس قدر تجارت۔ سیاحت اور علوم و فنون کی ملک میں ترقی ہوتی جائیگی۔ اسی قدر یہاں کے باشندے ترک وطن اختیار کرتے جائیں گے اور اسی طرح رفتہ رفتہ ملک میں باشندوں کی تعداد ایک مناسب مقدار پر آ ٹھہرے گی۔ اس بیان میں ایک اور بھی خلل ہے۔ اوپر کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی مردم شماری زیادہ ہونے سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی پیداوار ہندوستانیوں کی خوراک کے لئے کافی نہ ہو اور اس سبب سے بہت سے لوگ بھوکے مرنے لگیں۔ اس اندیشہ کو وہ اس طرح رفع کرتا ہے کہ جب قحط سالیوں میں لوگ بھوکے مرتے رہینگے تو مردم شماری بڑھنے نہ پائے گی اور ملک کی پیداوار ملک والوں کو کافی ہوگی۔ گویا بھوک سے مرنے کا علاج بھوک ہی سے مرنا بتاتا ہے۔

ہے اگر غلبہ[۱] کا کثرت پر رعایا کی مدار — ہند ہو سکتا ہے آدھی ایشیا پر حکمراں
کچھ بھی ہمت ہو اگر اس میں تو پھر ممکن نہیں — آنکھ اٹھا کر دیکھے کوئی سوئے ہندوستاں
بلکہ خود لیجائے وہ فوج اور لشکر اپنے ساتھ — اور گاڑے جاکے حد میں غیر کی اپنا نشاں

اور اگر کچھ بھی نہو تو بھی کیے جائے بسر
عزت آزادی بزرگی آبرو سے اپنے گھر

مملکت اتنی ہو جس کی اور رعیت اس قدر — ہو زمیں ساری خدا کی برکتوں سے بہرہ ور
ایسے سلطان بلند اقبال فرخ فال کو — اور پھر کیا چاہئے کچھ بھی قناعت ہو اگر
ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسر کشمیر آج — یا کوئی گنگا کے میداں سے زمیں زرخیز تر
شہر ہے جو مرکز کشمیر[۲] مانند طلسم — طرفہ کیفیت سے ہے نہروں میں دل کی جلوہ گر
دیکھتے ہیں آب صافی میں جب اُس کا عکس کل — دوسرا دیکھیں کا نقشہ صاف آتا ہے نظر
باغ شالامار جو رونق فزا ہے اُس کے پاس — ہے وہ اک نیرنگ قدرت کا تماشہ سربسر

سبزہ و نسرین و گل کی سرزمیں کہئے اسے
صفحۂ گیتی پہ یا خلد بریں کہئے اسے

---

[۱] غلبہ کا مدار کثرت رعایا پر نہیں ہے۔ بلکہ رعیت کے ذہن میں یہ بات نشین ہونی چاہئے کہ ہمارے اور گورنمنٹ کے مقاصد متحد ہیں اور ہم ہماری ہی بہبودی کے لئے حکومت کی جاتی ہے۔ جب تک رعیت کو اسباب کا یقین نہو کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ سلطنت کی جاں نثار ہوگی۔ ۱۲

[۲] مرکز کشمیر سے مراد شہر سری نگر ہے۔

فی المثل تختہ زمرد کا ہے وہاں اک سبزہ زار ق   سایہ افگن اس طرح ہیں ہر سو اس پر چنار
جھیل کے چاروں طرف جس طرح آتے ہیں نظر   زیر و بالا اونچے نیچے کھڑے قطار اندر قطار
تھی بنانے سے غرض تیرے لیے باغ نسیم   باغ جنت کا نہ انساں کو رہے کچھ انتظار

چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی   جا بجا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار
اُن کی رفعت اور بلندی کی نہیں کچھ انتہا   سینۂ گردوں سے گویا اب نکل جائینگے پار

روز روشن میں جب آ کے جھیل پر پڑتا ہے عکس   نقرئی پانی پہ اُس کی پھر کوئی دیکھے بہار

اور پھر جمگھٹ زنان مہ لقا کا ہر طرف
(سامنا آفت کا فتنہ کا بلا کا ہر طرف)

جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں   تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں
ہر چمن یہاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے   ہر چمن میں یہاں مہیا ہیں مکان ہر مکیں
ان مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے   پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں
جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر منتہی   ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آ کر یونہیں
یعنی اقلیم ابد اور یہ جہان خامشی   طاقت انسان کی حد سے ہیں پرے دونوں کہیں
طرفہ سناٹا ہے اس سنسان کوہستان پر   جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دل نشیں

ہیں سراسر ناپدید آثار انسانی یہاں
منہ لپیٹے ہیں پڑے اسرار یزدانی یہاں

ڈھونڈیئے گر ان پہاڑوں کی بلندی کی مثال   ظاہر ان کا اور انگلستان کا ہے ایک حال
جیسے وادی کی زمیں سے تا افلاک پہنچے ہیں یہ   وہ بھی پستی سے یونہیں پہنچا ہے تا اوج کمال

ہے یقیں رہنے ہی میں ہو جائے کام انجام — ہو نہیں اُس کی بلندی تک پہنچنے کا خیال
تا پتی پر آ کے انگریزوں نے جب کھولی دکان — ایک مدت تک ترقی نے نہ بدلی اپنی چال
یعنی اُس دم تک کہ سکھوں سے ہوا گہرا بگاڑ ق — اور دریا ہو گئے پنجاب کے سب خوں میں لال
لشکر مقدونیہ کی قتل گاہوں پر ہوا — بعد مدت گرم پھر ہنگامۂ جنگ و جدال

اہلِ انگلستان کو جھگڑوں سے فرصت کم ملی
امن کو فتنہ کے ہاتھوں سے فراغت کم ملی

جب بغاوت نے اُٹھایا سر تو اُس سے بھی ہوا — آگ بھڑکی مرگ کی اور خون کا دریا بہا
عورتیں اور اُن کے بچے بے گنہ مارے گئے — گھر جلے اور دشمنِ جاں ہو گئے خود دوست و یا
بھائی بندوں کی جفائیں دیکھ کر غمگیں ہوئے — اہلِ انگلستان کے ساتھی تھے جو اہلِ وفا
اور ہزاروں نے یہ باندھا دل کے منصوبہ میں — عزتِ انگلستان کی اب خاک میں دیجے ملا
صفحۂ ہستی سے نام اُن کا مٹانے کے لئے — ہو گیا تیار جان و دل سے ہر چھوٹا بڑا
لیکن اُن کی گھات میں تھا شحنۂ قہر و غضب — پھنس گئے پنجہ میں اُس کے یک بیک اہلِ جفا

پر انگلستان کا ہو کر رہا آخر گراں
گرتے گرتے تھم گیا اقبال کا اُس کے نشاں

گو ہوئی دلّی پہ حاصل پر ملا فتح و ظفر — پرچمِ اقبال لہرانے لگا پھر بے خطر
پر نہ اُس فتحِ نمایاں کا ہوا اعلان کچھ — وسوسوں سے دل رہے سب اہل کے زیر و زبر
چونک چونک اُٹھنے لگے راتوں کو بدخوابی سے گو — کر گئی دنیا سے گویا فارغ البالی سفر
صبح کے ہوتے ہی سب کافور ہو جاتی تھیں شب — تخیلیں ہیبت ناک جو راتوں کو آتی تھیں نظر

راس یہ ٹھہری کہ پائے اب وہ قیصر کا لقب تابعِ فرماں ہیں جس فرماں روا کے بحر و بر
قوتِ بازو سے جو حاصل کیا ہے قوم نے وہ ہمایوں تاج رکھا جائے اُس کے فرق پر

تاکہ سب جانیں کہ رخصت ہند سے فتنہ ہوا
عہدِ انگلستان کا جو کچھ کہ تھا پورا ہوا

اس نویدِ روح پرور کی اشاعت کے لئے ہند میں آیا پرنس آف ویلز انگلستان سے
ایلبرٹ اڈورڈ جس کے دودۂ اقبال میں سو جلیل القدر سلطاں اس سے پہلے ہو چکے
جس کے دادا نے کیا زیر و زبر نظمِ فرانس اور بتاتا ہے لقب جس کا پتے اس جنگ کے
دی فرانسیسوں کو جس میں زک وہ انگلستان نے جس سے واقف ہیں فرنگستان کے چھوٹے بڑے
حاکمِ بوہیمیا کی چھین لی تھی جس میں ڈھال خود ولیعہدِ زماں نے یاوریِ اقبال سے
جس پہ لکھے اعترافِ بندگی کے برملا حاکمِ بوہیمیا کے دستخط سے ثبت تھے

جمع تھے جس ذاتِ والا میں فضائل بیشتر
وہ ہوا مامور اس کارِ عظیم الشان پر

وہ مبارک وقت جب لنکا سے لیکر تا عدن اُس کے آنے کی خوشی میں جھومتے تھے مرد و زن
راگ گائے جاتے تھے ہر سو مبارکباد کے جوشِ شادی میں در و دیوار بھی تھے نغمہ زن
شہر میں جنگل میں ہر میدان ہر راہ میں جمع تھی اُس کے لئے خلق انجمن در انجمن
وہ سہانے بول ٹھمری کے وہ باجوں کی گھمر پڑ رہی ہے جن کی گویا کان میں اب تک بھنن
کھنچ چکے ہیں اس ہمایوں جشن کے نقشے بہت تو بھی لے وکٹوریا اے فخرِ شاہانِ زمن
چاہتا ہوں کھینچنا خاکا اس دربار کا جس میں کی تو نے قبائے قیصری زیبِ بدن

جس میں تیرے نام کا ڈنکا بجایا قوم نے
جو کہا تھا منہ سے آخر کر دکھایا قوم نے

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا

تو ہے سرمایۂ عزت بایں
تو ہے انسان کی دولت بایں

ہے زمانے میں بڑی بات تری
دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری

وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا
تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا

ہے عجب جس کو خدائی مانے
اس کی تو خوبیوں میں شک جانے

سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے
لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے

نامِ اقبال ہے آنے کا مرے
لقب ادبار ہے جانے کا مرے

مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما
علم بھی ایک طفیلی ہے مرا

لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں۔ مگر
میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدرِ بشر

چند روز آ گئی میں جس کے کام
زندہ تا حشر رہا اس کا نام

جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
وہ سدا خوار و نگوں سار رہا

میں ذرا جس کو لگا لیتی ہوں
اس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

جانتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں
پھرتے ہیں دھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو
کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دُنیا کی روا
درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہیں راہ کروں
ہو اگر شہر تو رو یاہ کروں

الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم
کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں یاد تجھ کو

تو بتا مختصر ہے تجھ میں وہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے ہنس کے کہا اے دولت
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے۔ مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجئے فرض تجھے گر چشمہ
تو ہوں اُس چشمہ کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں؟
پہلے دریا ہے کہ مچھلی نادان

تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا گر عطر آگیں
میں ہوں اُس عطر کی واقف تو نہیں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جتنے قبضہ میں ہوں میں اے دولت
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت

لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُن کی مٹھی میں ہے تو اسے دولت　　طائرِ رشتہ بپا کی صورت
نہ کہیں جس کا بدل ہے مفقود　　جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
کھوئے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر　　جا کے میں ہات سے آتا نہیں پھر
ایک پل میری اگر دیجے گنوا　　نیچے ہات اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا
تو اگر اپنی لٹا دے ثروت　　پل وہ ملتی نہیں پھر اسے دولت
ہیں اسی واسطے جو اہلِ تمیز　　میری ایک ایک پل اُن کو ہے عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس　　ہے مرا جاگتے سوتے انھیں پاس
جانتے ہیں حکما و عرفا　　مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں　　اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں
نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام　　نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ انھیں دین کی دولت ہات آئے　　اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیاسے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ　　نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے　　نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے
گن تو ہیں مجھ میں بہت اسے دولت　　ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو　　بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری ایک اک آن

غزلیات

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا — اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا — بندے سے مگر ہوگا حق کیونکہ ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نا محرم — کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا

چھپتا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی — کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

ق

عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی یاں — ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو — جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بےخود — جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

سمجھا ہے پرے تجکو ادراک کی سرحد سے — جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھکر — عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری — گھر گھر لئے پھرتی ہے پیغام صبا[1] تیرا

---

[1] یہ اشارہ ہے اِس حدیث کی طرف ألا إن لله نفحات في الدهر ألا فتعرضوا لها یعنی خدا کی خوشبوئیں زمانہ میں پھیلی ہوئی ہیں سو اُن کا آگا لو اور اُن کو اوپر نہ جانے دو ۱۲ حالی

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گذرتا ہے
کچھ رنگ بیاں حالیؔ ہے سب سے جدا تیرا

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ — ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
[illegible] — جو حل ہوا تو ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو سب پر دل بندھے ہوئے ہیں — ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں — لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل سکے کوئی — پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی — آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھئے — دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
ہے پر زوال سے دل اُس کا قوی زیادہ — رکھتی ہے آسرا اک جو بے زوال تیرا
ہے پاس دوستوں کی تیری یہی نشانی — یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالیؔ یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

رہ میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا
نہ جی دکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے اس کو ٹوٹے
رہے سدا نامراد جویاں انھیں بھی امیدوار دیکھا

رُخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا

سوارِ محمل کی جستجو میں ہزاروں دشتِ طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اُٹھتا غبار دیکھا

جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا کبھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اُس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا

لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پُرخطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کر کے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا

بنے ہوئے کاہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
دگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا

چمن میں جھونکے سے ہوا کبھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل اُن کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہے کیا ہے کون ہے اور تو کہاں ہے
یہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اک استوار دیکھا

سلوک میں تیرے سب ہیں یکساں وہ گبر و ترسا ہو یا مسلماں
نہ اُن سے کچھ تیرا بیر پایا نہ اِن سے کچھ تیرا پیار دیکھا

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں کہ یاں اختیار سب کچھ اُنھیں بھی بے اختیار دیکھا

بستر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بیکار تجکو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا — چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
مضموں ہے نقش دل میں لدینا مزید[1] کا — کونین سے بھریگا نہ دامن اُمید کا
قفلِ درِ مراد سب اکبار کھل گئے — چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا
دیکھا ہے ہمنے عالمِ رحمت کو غور سے — ہے شش جہت میں قحط دلِ نا اُمید کا
شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں — انجام ایک ہو گا شقی و سعید کا
ہے نردبانِ جذبۂ توفیق درمیاں — یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا
ہے اتکال پہ تیرے جگر خوار کا دماغ — خونِ جگر میں نشہ ہے جام نبید کا
تسکیں نہیں مشاہدہ گاہ گاہ سے — یارب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا
دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر — لا تقنطوا جواب ہے ھل من مزید کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکی الصفات یا بشری القویٰ — فیک دلیلٌ علیٰ انک خیر الوریٰ

[1] قرآن شریف میں ہے لھم ما یشاؤن فیھا ولدینا مزید یعنی اہل جنت کے لیے جنت میں وہ جو کچھ چاہیں گے سب کچھ ہو گا اور (اس کے سوا) ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے ۱۲ حالی

تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باراں سے خاک — خلقک خصب الزماں بشک محیا الورےٰ
دعوئے روشن ترا ثابت ہے بے بینہ — صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا
قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور — اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا
غیب سے کھینچا تجھے تا پتا پھرتا تھا جب — دشت میں بھٹکا ہوا قافلے سے رہنما
اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت — جیسے کہ ہنگام قحط قبلہ سے اٹھے گھٹا
شان رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں — گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا
گلۂ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو — گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا
دوڑ پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں — امیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا
راہب و قسیس و حبر رہ گئے دل تھام کر — دیکھ کے تیرا قدم ہم قدم انبیا
خاک تھی جس ملک کی مزرع شر و فساد — تو نے اسی کو دیا ارض مقدس بنا
تو نے تحمل کیا قوم کا غالب تھا جب — جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا
چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت — تو نے کیا دام دام قرض سب ان کا ادا
تو نے کیا ستر حق عارف و عامی پہ فاش — ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا
چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی — ایک کے جی کو لگا ایک کو گھائل کیا
حجت حق کر چکا دین ترا جب تمام — پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما
دیر[1] ہوئے بے چراغ اور صلوات یہود — شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا
بجھ گئے آتشکدے بیٹھ گئے بتکدے — ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت[2] فنا

---

[1] دیر راہبوں کلیسا۔ صلوات۔ یہودیوں کا کلیسا۔ ہبا غبار یا چیز۔ [2] مجوسی جو دو خدا ایک خالق خیر ایک خالق شر یعنی یزدان اور اہرمن کو مانتے ہیں اس عقیدہ کو ثنویت کہتے ہیں۔

اُٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھاس — مزبلہ پر چند روز باقی ہے نشو و نما
غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام — مل گئے اُٹھ اُٹھ کے سب خاک میں اہلِ ہوا
رہ گیا نامِ سجاح[۱] کذب میں ضرب المثل — اسود و ابن کثیر خوار ہوئے بر ملا
سلسلۂ انبیا ختم نہ ہوتا اگر — حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اُٹھا
آتے ہی چشمہ دیا تو نے کنوئیں سے نکال — جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا
بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ — کھنچ چکا تیرے ہاتھ ملّتِ بیضا حدا

تجھ پہ صلوٰۃ و سلام ربِّ سمٰوات سے
روز و شب و صبح و شام قدرِ مال و جلے

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں — جو زد پہ تیری آیا اُس کو گرا کے چھوڑا
راجوں سے راج چھینے شاہوں سے تاج چھینے — گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ — جو گنج تو نے تاکا اُس کو لٹا کے چھوڑا
جس رہگذر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر — صنعاں سے راست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا
فرہاد کوہکن کی لی تو نے جان شیریں — اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
یعقوب سے بشر کو دی تو نے ناصبوری — یوسف سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

---

[۱] سجاح ایک عورت مدعیہ نبوت کا نام ہے جس کا کذب عرب میں ضرب المثل ہے چنانچہ کہتے ہیں ھو اکذب من سجاح اور اسود عنسی و مسیلمہ جس کی کنیت ابن کثیر ہے یہ دونوں مدعی نبوت تھے جو آخر کار قتل کئے گئے ۱۲

لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دلگداز تیرے — پتھر کے دل تھے جن کے اُنکو رُلا کے چھوڑا

عقل و خرد نے تجھسے کچھ پیچ نقش جہاں کی — عقل و خرد کا تو نے خاکہ اُڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں ڈیلے ترے ہمیشہ — ہر معرکہ میں تو نے اُن کو دلا[1] کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش — شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا

اُسکے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

دیکھا ہے اُمید کیجیو ہم سے نہ تو کنارا — تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے — اے آسماں کچھ اسمیں تیرا بھی ہے اشارا

میخانہ کی خرابی جی دیکھکر بھر آیا — مدّت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضارا

اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے — اے زاہدو تمہارا اسمیں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے جیج اُٹھتے تھے ہم اوّل — آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی تہمت پر خبریاں — جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے — جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا — خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا

اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کے — اسلام ہے فقیہو ممنون بہت تمہارا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ — سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اسکے کیا کام

اچھا ہے یا برا ہے پھر یار ہے ہمارا

---

[1] دلانا کشتی دلانا یعنی پچھاڑنا ۔ اکثر کشتی کا لفظ حذف کرکے صرف دلانا بولتے ہیں ۔۱۲

رونا نہ ہوگا حالیؔ شاید یہ کم تمہارا
جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمہارا

الفت میں دم بدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی
چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا

عاقل ہیں یا شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمہارا

دیکھو نہیں کوئی یاں حیف اے صنم پرستو
دلکش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمہارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمہارا

دشتِ طلب کے رستو الٹے ہوگے کس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا

دو بینواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو
بس جام جم ہمارا اور ملک جم تمہارا

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

ہوتے ہی تم تو بیدل کچھ رو دیئے سوارو!
ہے لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گذرا ابھی ہے یاں سے خیل و حشم تمہارا

پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے تمہیں میں یار و باغِ ارم تمہارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالیؔ
کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ قلم تمہارا

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ یار و ہیں توانا
یہ ہو چکا ہے بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہرِ وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دُنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں — چھل بل میں تم اِس زالِ فسونگر کی نہ آنا
افسوس کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی — تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا
یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی — اب واقعہ سب اپنا پڑا ہے ہم کو سُنانا
دُنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن — وہ دن ہے کہ جس دن ہے اُسے چھوڑ کے جانا
لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت — فرمایا "خبردار کہ نازک ہے زمانا"

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو! تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اِس کا چرچا نہ کیجئے گا
ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اُس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُس کو تصوّر اپنا نہ کیجئے گا
سُنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ
یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجئے گا
اِسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد اِس کی بھول کر بھی کبھی تمنّا نہ کیجئے گا
کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے ہو کچھ
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اِس کی پروا نہ کیجئے گا
کمال سے ہے ضد بے کمالی نہیں ملاپ اُن میں حرف گیرو!

جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجئے گا تو آپ بچا نہ کیجئے گا
لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ درد الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجئے گا
تمہارا اتھاہ دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو
سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجئے گا

ہو عزم دیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
آتا ہے دور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا

قید خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہیگی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیر مغاں سے ہو کر تب سرخرو ملینگے
فضل و ہنر کا ہو گا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہے گر وہ تو ہے ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
کر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لینگے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا

معنے کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے پاسبان محل شاہی دن ہو گیا جب آخر
خواب گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یاد گل کا دور خزاں میں کس کو
اے عندلیب نالاں یہ تو نے گل کھلایا

ویراں ہے باغ پھر بھی پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یا رب بلبل کو کیا سنایا

اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے ‏ ‏ احسان اُس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم ‏ ‏ کوئی جواب شافی پر اُس سے بن نہ آیا

آیا نہ تھا کبھی یاں گویا قدم خزاں کا ‏ ‏ دو دن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

تقلید قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسین ‏ ‏ تو ہم نے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اُٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی جچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہم کو اُن کا نشاں نہ پایا

نفس دعویٰ بیگناہی کا سدا کرتا رہا ‏ ‏ گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی دیر میں نے کفراں میں کی ‏ ‏ وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی ‏ ‏ چھپکے چھپکے نفس خائن کا کہا کرتا رہا

طاعتوں کی زد سے بچ بچ کر چلایا ناخدا ‏ ‏ وار اُن کا اس لئے اکثر خطا کرتا رہا

نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی ‏ ‏ اُس کو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا

مُنھ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہیں ‏ ‏ اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاقِ تحسیں پر تھی تحسیں سدا ‏ ‏ حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا

شہرت اپنی جسقدر بڑھتی گئی آفاق میں ‏ ‏ کبرِ نفس اُتنا ہی یاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظلم و جفا کرتا رہا

کہیں الہام منوانا پڑے گا ۱ کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نہ ہو صوفی صفا کو تجھ میں لیکن ۲ کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد — یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا
جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا — اُنھیں سچّوں کو جھُٹلانا پڑے گا
عوام الناس کا ہو گا جنھیں منھ — اُنھیں خاصوں پہ منھ آنا پڑے گا
رہے وصفِ جناں کی مشق واعظ — تمھیں بچّوں کو پھُسلانا پڑے گا
سخن میں پیروی کی گر سلف کی — اُنھیں باتوں کو دُہرانا پڑے گا
تعلّق کا ہے پھندا پیچ در پیچ — یہ عقدہ ہم کو سُلجھانا پڑے گا
ق
بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں تم نے — بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
نہیں جو اُنس کی اس غمکدے میں — کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا
دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے — ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا
زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند — وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا
جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید — ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اُسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا — یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی — تمھیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی — بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا
بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن — جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی

مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا
مینھ کبھی رحمت کا کبھی برسائے گا

پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا

دوست کا آیا ہے سمجھو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد
اک یہ لپکا دیکھئے کب جائے گا

ق

واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے
پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم
ہم پہ منھ آئے گا منھ کی کھائے گا

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی قفس میں اُس کا کیا گھبرائے گا

ق

رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا
شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا

ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ
دیکھئے برسے گا یا برسائے گا

مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

واں اگر جائیں تو لیکر جائیں کیا
منھ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں باقی ہے وہی حرصِ گناہ
پھر کئے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا

آؤ اس کو لیں ہمیں جا کر منا
اُس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو — کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی — مرحلے اب دیکھئے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر — سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے — اک بزرگِ دین کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزلخوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا — اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اس نے تو اللہ سے غافل ناصح — اس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چھپ چھپا لیتے اسے دے کے دل اک بات پہ ہم — مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو نالہ سے نہ مٹنا تھا پھر ہو لی خموش — نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے — جیتے جی کا بھی اگر دل سے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لیکے نہ آیا یارو — تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اس قیمت سے سر پہ ترے منڈلاتا تھا — گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا — ہے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا بیٹھے اگر ہے نہ عشق ناصح — وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق — کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا — بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالیؔ

کہتے پہلے سے تو چپکے سے ہٹایا جاتا

راحت کا جہاں میں یونہیں اک نام ہے گویا — راحت کی تلاش اک طمع خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں — بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہے گویا

ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام — جو کام ہیں۔ اُن کا یہی انعام ہے گویا

ہے وقت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں — آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اٹھتا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد نئی طرح — آغاز ہی الفت کا یہیں انجام ہے گویا

اور بار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام — اسلام کا اور بار بھی اک نام ہے گویا

سب دیکھئے حالیؔ کو تو پاتے ہیں بیکار

کرنا اسے باقی یہی اک کام ہے گویا

خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا — تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفت جاں اس کا انداز کم اندازی — ہم بچتے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی — میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سنا تھا صاف — ان پڑھ ہے تو جب یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی — گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا

ہم روز وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت — رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحب دل ہوتے تم کر کے مری بیتابی — تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھکو خبر ناصح　　کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے　　گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا

کل حالیؔ دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ　　سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا　　تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سر گلستاں نہ تھا　　یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شاداں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام　　گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائیگا جی اک نگاہ میں　　تھی دل کی احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے　　تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بیخودی سے تمہارا زیاں نہیں　　تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب　　مجھکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں　　طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی　　مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزم سخن میں جی نہ لگتا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　وقت پہونچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا　　کاٹنا ہے شب تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا　　کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہونچے ہم　　شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اس سے ناداں ہی بن کر ملیے — کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ — حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جب تک — ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل — مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا
بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا — پوچھنا کیا تری زیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں! — گل و بلبل کی شناسائی کا
مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں — ہو چکا کام توانائی کا
محتسب عذر بہت ہیں لیکن — اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا — رو رو دیے ہم کو اور رلانا ضرور تھا
تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں — ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا
دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز — چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا
جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ — ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا
دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال — ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا
اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں — وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا
روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا — کچھ صبح ہی سے شام بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر　　بعد از نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائیگا　　سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھکو لاکھ ضبط　　الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست　　زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا
دیکھی ہیں ایسی اُن کی بہت مہربانیاں　　اب ہم سے مُنہ میں موت کے جایا نہ جائے گا
مے تند و ظرف حوصلۂ اہلِ بزم تنگ　　ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر　　دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے　　پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ　　ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
ملتا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر　　کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر　　یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

تپاک اور دل میں سوا ہو گیا　　دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل　　اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور　　مرا شکر اُس کا گلہ ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا گرچہ رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری امید مجھ کو جواب
رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

سنگ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا
اب دیکھنا ہے زور دل بیقرار کا

اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

آؤ مٹا بھی دو خلش آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگی مستعار کا

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

سمجھو مجھے اگر تمہیں ہے آدمی کی قدر
میرا اک التفات ہے مرنا ہزار کا

گر صبح تک وفا ہوا وعدہ وصال
سن لیں گے وہ مآل شب انتظار کا

اب محو ہوئے گل پہ ہوا کہ دل حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

ہر سمت گرد ناقۂ لیلیٰ بلند ہے
پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطر الفت شعار کا

حالی بس اب یقیں ہے کہ دل کے ہو رہے

ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اِس دیار کا

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب — کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذکرِ جمیل — خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر — ظلِّ بالِ ہما سے کیا مطلب
جو کریں گے بھریں گے خود واعظ — تم کو میری خطا سے کیا مطلب
جنکے معبود حور و غلماں ہیں — اُن کو زاہد خدا سے کیا مطلب
کام ہے مردمی سے انساں کی — زہد یا اتقا سے کیا مطلب ق
ہے اگر رند دامن آلودہ — ہم کو چون و چرا سے کیا مطلب
صوفیٔ شہر باصفا ہے اگر — ہو ہماری بلا سے کیا مطلب
نکہتِ مے سے غش ہیں جو حالی
اُن کو دُرد و صفا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا — چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
جس دل کو قیدِ ہستی دنیا سے ننگ تھا — وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب
آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو۔ بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا — ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب
ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز — ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ہے دل غمِ جہاں سے سبکدوش ان دنوں — سر پڑتا سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

یہ ہیں واعظ اب یہ منہ آتے ہیں آپ — ناصحِ قوم اسپہ کہلاتے ہیں آپ
بس بہت طعن و ملامت کر چکے — کیوں زباں رندوں کی کھلواتے ہیں آپ
ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو — چڑھ کے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ
واعظو ہے اُن کو شرمانا گناہ — جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ
کرتے ہیں اک اک کی تکفیر آپ کیوں — اسپہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ
کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور — خُلد کو ویران کرواتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خُلد سے
بسترا کیوں اپنا بھکواتے ہیں آپ

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا — جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت
ہٹ پہ اُسکی اور پس جاتے ہیں دل — راس ہے کچھ اس کو خودرائی بہت
سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں — دل پہ ہے نقش اُسکی رعنائی بہت
چُور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حُرؑ — راحت اس تکلیف میں پائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری — ہیں فدائی کم تماشائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی — یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اُٹھے جاتے ہیں یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل — ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار — اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے — یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص — اُس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر — آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اُس کے مزا درد میں اُس کے لذت — ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعد شکست ہے ضرور — رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا — راہ میں کچھ نظر آئی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار — پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

اُن کو حالی بھی بُلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھکر دل ہو عاشق کا بیکل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ وعدہ ہے بارِ عام اُنکے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہے اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جسکو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھکر کرو قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

رچ رہی ہے کان میں یاں سے وہی
اور مغنی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہ گئی
راج کسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے نگہ یاں بھی کچھ اے زاہد اچاٹ

جو کہے تجھکو سنا دیں اے امیر
ہیں بہت سرکار کی تحصیل پر چاٹ

ملتیں رستوں سے گئی ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

تیغ میں بُرّش یہ اے حالی نہیں　　جسقدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

باپ کا ہے جبھی پسر وارث　　ہو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث

گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا　　تیرا ہے کون اے ہُنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی　　لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ　　کریں میراث سے حذر وارث

خاک و کرمانِ گور و خویش و تبار　　ایک میت اور اسقدر وارث

واعظو دین کا خدا حافظ　　اشیا کے ہو تم اگر وارث

قوم ہے پر ہے دین بیکس ہے　　گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم یہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف　　جیسے مُردہ کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث　　دلِ جلوں کو تو نے گرمایا عبث

جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی　　رات بھر یاروں کو تَرسایا عبث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز　　سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

کوئی پنچھی آکے اب پھنستا نہیں　　آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم　　تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

کھیتیاں جلکر ہوئیں یاروں کی خاک — ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

قوم کا حالی پنپنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رلوایا عبث

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج — بول کر ہم نے منھ کی کھائی آج
چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ — بات بگڑی بنی بنائی آج
شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
بزم ساقی نے دی الٹ ساری — خوب بھر بھر کے خم لنڈھائی آج
معصیت پر ہے دیر سے یارب — ق نفس اور شرع میں لڑائی آج
غالب آتا ہے نفس دوں یا شرع — دیکھنی ہے تری خدائی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو — نیند پھر رات بھر نہ آئی آج
کل یہاں کاروبار ہیں سب بند — کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زد سے الفت کی بچ کے چلنا تھا
مفت حالی نے چوٹ کھائی آج

تلخی دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج — یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج
رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات — اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج
تھا قناعت میں نہاں گنج فراغ — پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج
فکر و سن بڑھتے تھے شاید ساتھ ساتھ — ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج
ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا — جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج

آ گئی مرگ طبیعی جسم کو باد   شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدھی ہے حالی سوئے دوست
ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ
نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن پر کہیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ
شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز

ہے یہ سب اونچی دوکاں اور رونق بازار ہیچ
شاہد معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سبحہ و سجادہ ہیچ اور جبہ و دستار ہیچ
ہو گرجتے جسقدر اُتنے برستے تم نہیں

اے فقیہو! ہے یہ سب گفتار بے کردار ہیچ
رو لیے تو آٹھ آٹھ آنسو اور سیپا دل نہ ایک
نکلے موتی نیسر سے سب اے چشم گوہر بار ہیچ
خوانِ نعمت سے ترے اے نائل مردار خوار

کر دیے آفاق کے سب خوان و خوان سالار ہیچ
ہے ادب مسند پہ جو کچھ ہے رئیس شہر کا

ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ
گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

کاٹے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزلِ دنیا میں ہیں یا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں جہاں سرا میں میہمانوں کی طرح
سعی سے اکتاتے اور محنت سے کتراتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں خوشحال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر کھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

آس کھیتی کے پنپنے کی اُنھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دئے جاتے کسانوں کی طرح
اُن کے غصے میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح
کام سے کام اپنے اُن کو۔ گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح
کیجئے کیا حالی نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

مئے مغاں کا ہے چسکا اگر بُرا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ
ریا کو صدق سے ہے جامِ مے بدل دیتا
تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
وہ نکلے کہاں مٹی جو بتاتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ
غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ دیکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
زباں پہ ہوتی ہے ٹھرا کی جو بیخ ہم رانڈ ق
پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادعا اے شیخ
خبر بھی ہے تمھیں ؟ کیا بن رہی ہے بیڑے کو
ہیں آپ جون سے بیڑے کے ناخدا اے شیخ
وہ ڈوبتوں سے الگ بنتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا بھی گر ہے ۔ مرحبا اے شیخ
گوزن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا
نہایت آپکی ہے اُن کی اقتدا اے شیخ

کہاں حُسنِ عقیدت سے آیا تھا حالی
یہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

شادی کے بعد غم ہے تفکری عنا کے بعد — اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد
ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور — ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد
تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد
گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا — آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد
یادِ خدا میں جب نہ گئی واں سے اُنکی یاد — آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد
کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم — ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد
آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر — تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد
مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر — بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سُن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سُنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد — تیرا قبلہ ہے جُدا میرا جُدا اے زاہد
درگذر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے — تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد
ہم دکھا دیں گے کہ زُہد اور ہے نیکی کچھ اور — کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد
قربِ حق کے لئے کچھ سوزِ نہاں بھی ہے ضرور — خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد
ہیں تو سو یار ملوں دل نہیں ملتا تم سے — تو ہی کہہ اس میں ہے کیا میری خطا اے زاہد
جال جب تک ہے پھیلا ہوا دینداری کا — فکرِ دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج گنے تو نے بیا
ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد

پیاس تیری ہو سے ساغر سے لذیذ　　بلکہ جام آبِ کوثر سے لذیذ
جس کا تو قاتل ہو پھر اس کے لئے　　کونسی نعمت ہے خنجر سے لذیذ
لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب　　ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ
قند سے شیریں تری پہلی نگاہ　　دوسری قند مکرر سے لذیذ
تھا تجھ میں جس بھوک کی بھوکے تو　　بھوک ہے وہ شیر مادر سے لذیذ
ہے یہ تجھ میں کس کی بو بار اے صبا　　بوئے ہے یہ مشک و عنبر سے لذیذ
جو قناعت کے ہیں حالی قدرداں
اُن کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر　　وہی اصرار ہے خطاؤں پر
رہیں نا آشنا زمانے سے　　حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
رہرو یا خضر ہو گئے گمراہ　　رہزنی کا ہے رہنماؤں پر
ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا　　مرتے ہیں ہم انہیں اداؤں پر
اس کے کوچے میں ہیں وہ بے پروا　　اکڑتے پھرتے ہیں جو ہماؤں پر
شہسواروں پہ بند ہے جو راہ　　وقف ہے یاں برہنہ پاؤں پر
نہیں منعم کو اس کی بو بھی نصیب　　مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
نہیں محدود بخششیں تیری　　زاہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالی — کیجیے کس منہ سے ان خطاؤں پر
کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر — ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار — عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں نہ اسکے آشنا — گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
خصلتیں رذیلہ کی رکھتے ہیں ہم — گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں — کرتے ہیں نفرت بدی سے جس قدر
کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب — کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم — کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر
کی نہیں جس نے کبھی کوئی بدی — شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر
ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب — ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر
عیب کچھ گنتے نہیں اس شخص کے — جس سے ہوں اپنے سوا اسکے خبر
خیر کا ہونا ہے ظن غالب جہاں — کھینچ کر لاتے ہیں اسکو سوئے شر
بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو — عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے ہے مطلب کے دوست — اپنے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہش تحسیں ہے حضرت کو مگر

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر — دام آنکھیں سکیں نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر
گو ہو شفا سے یاس پہ جب تک ہے دم میں دم — بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا — یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر
آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی — مہر وشوں کو رہے گا نہ عریاں کیے بغیر
عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آپڑی ہے ضد — چھوڑینگے نیجاں کو نہ بیجاں کیے بغیر
مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام — مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیے بغیر
گو مے ہے تند و تلخ - پہ ساقی ہے دلربا — اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر
تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی — چھوڑے گا وقت انھیں نہ مسلماں کیے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بیستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ — ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ
آج تک قصر امل ہے ناتمام — بندھ چکی ہے بارہا کھل کھل کے پاڑ
ہے پہونچنا اپنا چوٹی تک محال — اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ
کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار — پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ
دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے — سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ
عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ — دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اجاڑ
کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار — کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ
بات واعظ کی کوئی بگڑی گئی — ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

عہدِ وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز — عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز — جھونکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں — ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز
آیا ہوگا اُس کو تغافل میں کچھ مزا — ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا — اُس نے نقاب رخ سے اٹھایا نہیں ہنوز
یاں دیکھی جواب اُمیدِ جوابِ خط — واں نامہ بر نے بار کبھی پایا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا — کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد — چھوٹے ہیں کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز
سرمایۂ خلافتِ دو عالم ہے رازِ دل — باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

جیتے جی موت کے منہ میں نہ جاتا ہرگز — دوستو دل نہ لگاتا نہ لگاتا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی — دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑاتا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی — زد میں تیر صفتِ مژگاں کی نہ جاتا ہرگز
چاہت اک طلعتِ بکر وہ ہے برقع میں نہاں — کبھی دلالہ کے دھوکے میں نہ آتا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے — تو جوانی میں نہ یہ روگ بساتا ہرگز
جتنے رستے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق — آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بساتا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس — قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنواتا ہرگز

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لگ کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہستی ہوئی مشکلوں پہ نہ بہانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سوئے کہیں اے عشرتِ شاہ
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو ‏— ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ‏— نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر ‏— اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں۔ بزم سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

رنجش و التفات و ناز و نیاز ‏— ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں ‏— دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
شیخ! اللہ رے تیری عیاری ‏— کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اک پتے کی جو تو نے کہہ دی آج ‏— رنگ واعظ کا کر گیا پرواز
ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری ‏— تو گئی بھول ہم کو خاک حجاز
آج منکر بھی ناچ اٹھیں گے ‏— گر مغنی کی ہے یہی آواز
خیر ہے[1] اے فلک کہ چار طرف ‏— ق ‏— چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ‏— ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زور مند ضعیف ‏— بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے ‏— گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
ہے نہتوں کو رہگذر میں خطر ‏— رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

---

[1] یہ قطعہ اسوقت لکھا گیا تھا جبکہ ترکی کو سلطان عبدالعزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ
مانٹینگرو اور روس وغیرہ کے مقابلہ میں اخیر صدمہ پہونچا ۱۲- حالی

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم
بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لب گاز
ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے
گھائلوں پر ہیں ہیر تیہر آنداز
تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے
حیلہ گر روبہوں کے عشوۂ ناز
دشمنوں سے ہیں دوست خود جاسوس
اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھئے کیا کچھ
ہے پُر آشوب جبکہ یہ آغاز
ہے ابھی تک کھلی نہیں لیکن
غیب سے آرہی ہے کچھ آواز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر
موج ہائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے اُبھرے
یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز
کام اُسے اپنے سونپ دو حالی
نہیں جس کا شریک یا دانباز

ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے
چارہ یاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

جاذبِ رحمت ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس
رکھتے ہیں عاصی کمندِ صید غفراں اپنے پاس
عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر در گذر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس
ہوگئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس
بام تبلا یا بلند اور نارسا بخشی کمند

رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ بُرہاں اپنے پاس
خاک میں ہمنے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی۔ آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس
دستبردِ اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمد اللہ وہ خاتمِ سلیماں اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس

چھیڑ اب نہ اے تصورِ مژگانِ یار بس — کافی ہے خارخارِ غمِ روزگار بس
یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے — غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس
ہر داغ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا — گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس
ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں — اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ — یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ یہ ہو رات اب سحر — کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس

تھوڑی سی رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

اک ہم کو غمِ بسرِ ایام ہے درپیش — تنہا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش
غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے — اور معرکۂ گردشِ ایام ہے درپیش
وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز — اب اس مرضِ صعب کا انجام ہے درپیش

گو صبح کبھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت — پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہے درپیش
وہ وقت گیا نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا — اب وقت خمارِ مے گلفام ہے درپیش
امیدِ شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے — اب موت کا سننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

ہر بشر سے اُسکی مختص ہیں عطائیں خاص خاص — ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص
دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دُنیا سے مگر — رہزنِ دل ہیں ابھی اُسکی ادائیں خاص خاص
گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گل — یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص
زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب — وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے اُمید سب کچھ پر نہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص — یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص
حور و غلماں کے لئے لائیں دل آخر کس کا — ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برآ ایک ہی شخص
قافلے گذریں وہاں کیونکر سلامت واعظ — ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص
قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں — فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص
جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے اِن آنکھوں نے — آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص
گدیاں برکت سے ہیں۔ مگر فیض ہے جاری شب و روز — کچھ سہی شیخ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اے حضر افسوس کہ زمانہ کے ہے حالی یہ نچوڑ

شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض — چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
دل میں ہے لے خضر گر صدقِ طلب — راہرو کو رہنموں سے کیا غرض
حاجیو ہے ہم کو گھر والوں سے کام — گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض
گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو — ان کو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض
نیک کتنا نیک جس کو دیکھتا — ہم کو تفتیشِ درون سے کیا غرض
دوست ہیں جب زخمِ دل سے بیخبر — ان کو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض
عشق سے ہے مجتنب زاہد عبث — شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض
کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب — اب اسے دنیائے دوں سے کیا غرض

آئے ہو حالی پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

دوست کا نا روا انہیں اعراض — دوستوں ہی کا کام ہے اغماض
چاہیے ایک سب کا ہو مقصود — گو ہوں سب کے جدا جدا اغراض
یاد میں تیری سب کو بھول گئے — کھو دیے ایک دکھ نے سب امراض
دیکھیے تو بھی خوش ہے یا ناخوش — اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض
لَا اُبَالِی بِاَنْ یُّعَاتِبَنِیْ — کُلُّ نَاسٍ وَّ اَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ
منعمو بذلِ خیر میں یہ دیر — اپنا مطلب اور اس پہ اغماض
حق میں اپنوں کے سخت ممسک ہیں — جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

رائے ہے کچھ علیل سی تیری — نبض اپنی بھی دیکھ اے نبّاض
وعظ میں گُل کترتے ہیں واعظ — مُنھ میں اُن کے زباں ہے یا مقراض
ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع — هَلْ لَنَا فِي نِزَاعِنَا مِنْ قَاضٍ
ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد — نارکش تجھ سے ہے سوا مرتاض
شیخ کی تھی یہ آخری تلقین — چاہیے زر تو اس سے کر اعراض

ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

رات گذری ہو چکا دورِ نشاط — طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
دل سے خوشیاں ہو گئیں اب گوشہ گیر — نام تھا شاید جوانی کا نشاط
دن اب ایسے منغّص رہنے کے ہیں — ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں — فصلِ گُل کی تھی فقط اتنی بساط
زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ — جانیو واعظ اسے راہِ صراط
تو بھی کھاتے ہیں نہیں محتاط شیخ! — ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

کوچ کی حالی کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دمبدم اب انحطاط

چھپے ہیں حریفوں میں اسرار واعظ — بُرا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ
سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر — نہ ستّار ہے تو نہ غفّار واعظ
نکل آئے گی میکشی کی بھی حالت — کوئی دن گیا گر ہمیں یار واعظ

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن — سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ
ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن — یہ جبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ
نہ چھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو — یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ

مسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے
ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

اے بہارِ زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاضِ صبحِ پیری السلام — اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
السلام اے قاصدِ ملکِ بقا — الوداع اے عمرِ فانی الوداع
روزگارِ ضعف و سستی الصلا — وقتِ سعی و جانفشانی الوداع
فرصتِ عشق و جوانی الفراق — ق — دورِ عیش و کامرانی الوداع
تجھ کو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں — اے نعیمِ جاودانی الوداع
تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں — اے خدا کی مہربانی الوداع

آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ — دیکھ اس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ
ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں — حملے سے یاں اجل کے نہیں ایک دم فراغ
یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
دو چار گام نقشِ قدم مل کے رہ گئے — آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہوں — ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ
جنگل میں تختۂ گلِ خود رو کو دیکھکر — تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
باری تب اُن کی آئی کہ گُل ہو گئے چراغ

حق نہ مُلّا نے کچھ بتایا صاف — اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف
آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھلی — مہرِ روشن نظر نہ آیا صاف
کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم — صاف تھے آپ سب کو پایا صاف
زاہد و ہم تو تھے ہی آلودہ — تمکو بھی ہمنے کچھ نہ پایا صاف

کیوں فقیہوں سے رک گئے حالی
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لائق — نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لائق
کرے گا کیا ترا کحل الجواہر اے کحال — نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لائق
مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ — بہت ہے زندگیِ مستعار کے لائق
غرور و حرص ہیں زیورِ عروسِ دنیا کے — بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لائق
کرے گی بادِ بہار آکے اب کسے سرسبز — رہا نہ باغ قدومِ بہار کے لائق
بس اب ہے فصلِ دے و ماہ و گرگ برگ ریزاں — رہا نہ شیرِ ژیاں خود شکار کے لائق
گنہ کا عذر کریں محتسب تم آنکھوں سے — ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لائق
گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی — تمہیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

یہ ہمنے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لائق

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک — تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک
سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں — جہاں ہے راہزنِ خلق رہنما ایک ایک
زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر — بنا ہے غوثِ زماں آجکل گدا ایک ایک
رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی ہیں — مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک
وفا کی ایک تجھی سے امید ہے اس وقت — کہ یار یار سے ہو جائیگا جدا ایک ایک
چھپا کے اس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے — جب آپ منہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک
ہوا نہ ایک بھی حق اس کی بندگی کا ادا — کیا ہے جس نے حق تھا جگی ادا ایک ایک
امیرِ حاج کی نیت میں گر نہ آئے قصور — تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک
ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو — ورق جب اُن کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ — جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک
وہ عشق ہے نہ جوانی وہ تو ہے اب نہ وہ ہم — پہ دل پہ نقش ہے اب تک تری ادا ایک ایک
نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دلخراش جہاں — رہیگی حالیِ دلگیر کی صدا ایک ایک

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ — ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں نیز شوں میں بے لگاؤ — رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو — ہے عشیرہ اور اُن کا دودماں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں — ہے کوئی بھیدی اور اُن کا رازداں سب سے الگ
جانچتے اوروں کو ہیں خود دیکھے اپنا امتحاں — رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ

اک چمن بہرِ تفرّج رکھتے ہیں زیرِ بغل ۔۔۔ روضۂ و بستان و فردوس و جناں سب سے الگ
کلبۂ احزاں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے ۔۔۔ ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند ۔۔۔ پر ہوے کوئی دل اُن کا تو واں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے ۔۔۔ دردمندوں کا ہے دُکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دُکاں سب سے الگ

صُلح ہے اک مُہلتِ سامانِ جنگ ۔۔۔ کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
عہدِ گیتی پر نہ بھولیں کامراں ۔۔۔ آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا ۔۔۔ سب لیے تیار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
روکئے بدخو کو بدخوئی سے کیوں ۔۔۔ آپ اپنی خو سے آجائے گا تنگ
زُہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ ۔۔۔ یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
پاکبازوں کو نہیں قیدِ وضع ۔۔۔ جو ہیں اچھے اُن پہ سب جچتے ہیں رنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا ۔۔۔ دم میں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل ۔۔۔ دیکھ کر پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ
کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح ۔۔۔ اب لگا کھانا پینا سب کے انگ
عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ ۔۔۔ ہے ابھی کم حاصلِ افیون و بھنگ
بڑھ گیا ہے رحمِ انسانی بہت ۔۔۔ ہو گی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق

پھوٹ ہی کا بس کھٹکے گا ہمیں تک

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل — یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل
رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف — اور ابھی ہونا ہے شاید تبدل
اک سنبھلنے ہم نظر آتے نہیں — ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل
کب تک آخر ٹھہر سکتا ہے وہ گھر — آ گیا بنیاد میں جس کی خلل
ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار — تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ امل
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی — لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل
دیکھئے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع — ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل
کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں — وقت کوشش کا گیا شاید نکل
اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

غزل

مدرسہ میں دہر کے رو رو قضا بیٹھے تھے ہم — اٹھے ہیں ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم
پھر بھی ہم ہیں کہ عشوہ ہائے کافر کے لوٹ — ڈال دنیا سے ابھی ہو کر تنہا بیٹھے تھے ہم
صحبتیں اہلِ ورع کی سب گئیں تقریروں پہ گر — بزمِ رنداں میں یونہیں اک دو جا بیٹھے تھے ہم
شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی — ورنہ دھوکا - دور سے دیکھا کیا بیٹھے تھے ہم
ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشتیٔ دل سے تری — آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم
سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر — ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم
ہے خود دنیا ہی پشیمانی نہ حالی ورنہ یاں

دین تک دُنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم

دل میں ہے دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم

ہیں فدا اُن دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپکو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم

بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا
گر کبھی توفیق ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں شکر
درد جو ناکامی کا لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشمِ عالم میں بھلے
حال اغیں دوں کا اتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم

جس قدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
تہ نشیں اس میں مگر دُردِ ریا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھئے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر

رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگی شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیٔ جاوداں سے ہم

لیتے وہ چین کوئی دم اے منکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اسکے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالیٔ جادو بیاں سے ہم

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اسکی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو بالوں
اب دیکھتی تجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونو بری ہیں تیری
جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جسکو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں تیری جتنی جاں بخشیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار پہر ہنستے ہیں چار پہر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی اُن کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

روتے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گلفشانیاں ہیں

جب سے سنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں

کچھ روز دن غفلت میں پھرے یاں ڈھونڈھتے تھے ہم آسائش کو
کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا ارمان ہمیں

چل سکے نہ کوئی اک چال فلک نے کھو دیئے ہوش حریفوں کے
دوست نے چاہیں یا بات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس اُٹھیں گر اپنا ذرا ہو جان اپنی بھی اُن پہ فدا ہم
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس نہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اُس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

یاں تو بدولت زہد و ورع کے بچ گئی خاصی عزت سے
پَر نہ پڑا پر کل کے لیئے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُر تھے وہی اور نال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہمان ہمیں

کی تو ہیں ہمنے بھی حالی کوچ کی تیاریاں — سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں
خواب راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں — جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں
ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار — ناگوار اُن سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں
ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی — سب کو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریاں
زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال — اپنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں ہشیاریاں
بے مزہ ہے اہل دیں کی ترشروئی بھی مگر — اِس سے پھیکی اہل دُنیا کی ہیں ظاہر داریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادّے فاسد نکل
کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خود اپنا ہدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جنّتی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

جُرمِ خالق سے سوا پاتے ہیں جُرمِ فقہا
جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ!
بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جب سے زاہد
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب ہنر دکھلاؤ
ورنہ یاں عیب تو سب فرد بشر کرتے ہیں

غمزدہ رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جن میں کہ گھر کرتے ہیں

جی رکاوٹ سے جو ان کی کبھی رک جاتا ہے
اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں

اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یا رب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

قیصر و زار کا یاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گذر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اس میں

کی نصیحت بُری طرح ناصح
اور اک بِس ملا دیا رس میں

ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشمِ انساں و چشمِ نرگس میں

بے قدم دم میں خائف ہوں میں
سب ذلیلِ علم ہیں مدارس میں

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُس میں اور اِس میں

ہو قبضے میں جب عنانِ فرس — ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں
جس سے نفرت ہے اہل نعمت کو — وہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں — درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور۔ آدمی۔ فرشتہ۔ خدا — آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
آج کل جیرخ صلح جو ہے بہت — دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

بوالہوس عشق کی لذّت سے خبردار نہیں — ہیں مئے ناب کے دلّال قدح خوار نہیں
شہر میں اُن کے نہیں جنسِ وفا کی بکری — بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے یہ خریدار نہیں
کون سے وہ گُلِ رعنا پہ نوا سنج نہیں — کون سی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں
کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا — اور جو پھر دیکھو تو دونوں سے سروکار نہیں
اُٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی اُن سے — دل پھنسا کر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں
عشق میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ — اور جو ہو کیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا اُن کو — دربدر جھانکتے پھرتے ہیں اُنھیں عار نہیں
بوالہوس کام طلب بندۂ نفس اہل ہوا — ایک عالم ہے اسی رنگ میں دو چار نہیں
دعوئ عشق و محبت پہ نہ جانا اُن کے — اِن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آ کے پھر چمن میں
اک حشر سا ہے برپا مرغانِ نغمہ زن میں

بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں

بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا
پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں

چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشمِ نرگس
قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

ہیں اور تو ادائیں ساری سہی قدوں کی
پڑتی ہے جان باقی بس سرو و نارون میں

ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں
جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نامِ اسلام
بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی؟ اس پر کیا گذری انجمن میں

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اسے جا
رندوں میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

روبہ کی جون میں ہے مرغوب اب وہ ملّت
تھی سہمناک کل تک جو شیر کے بدن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستندِ یمن[1] کی
ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے
ہے کال موتیوں کا اب سربسر عدن میں

قبرِ اویس رض پر ہے بس فخر اب قرن کو
زندہ اویس رض کوئی باقی نہیں قرن میں

---

[1] یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ "الایمان الحکمة یمانیة" یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے" اسی بنا پر میر باقر داماد نے اپنے فلسفہ کا نام حکمتِ یمانیہ رکھا ہے" ۱۲-

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اُڑا دی   فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں
ڈالی نہ ہو گی آگے اسے دورِ چرخ شاید   جو ایکے تونے ہل چل ڈالی ہے انجمن میں
فوج اور جھڑ دونوں پھرتی ہیں بے سری کی   گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رن میں
خرد و بزرگ سارے ہیں بد حواس۔ گویا   لٹنے کی قافلے کے پہونچی خبر وطن میں
بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی بھی   جائیں کدھر کہ ہر سو دوں لگ رہی ہے بن میں
حالی بس اب نہیں یاں بیٹھنے کی تاب باقی   مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور   ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر   تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق   رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں کسل و رنج و راہ کا   خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر   اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور   عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی   دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

پیا ہے ہم نے نہ جام ہے کدورت بزمِ دوراں میں ‌ ‌ خزاں کو لے گئے ہمراہ اگر پہونچے گلستاں میں

نہیں کچھ منحصر دولت کی زلفِ پریشاں میں ‌ ‌ جو دل چاہے تو الجھے اک غبارِ رہ و دیجاں میں

اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشق زلیخا نے ‌ ‌ نہ رہنے دے گا حسنِ خودنما یوسف کو کنعاں میں

تصور نے بٹھایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو ‌ ‌ نہ کچھ کلفت شبِ زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں

خوشی میں بھی نہیں ہنسنا نہ خوش آتا ایک حالت پہ ‌ ‌ کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی دردِ ہجراں میں

زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز ‌ ‌ نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

فلک سے جیتے جی معلوم لیتا کام دل اپنے خضر ‌ ‌ سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آبِ حیواں میں

نہ چھوڑے گی محبت یار سے ناکام عاشق کو ‌ ‌ نسیمِ مصر کو آنا ہے اکدن بیت احزاں میں

گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے ‌ ‌ ہمارا کبھی بھی لگتا تھا دلِ سیرِ گلستاں میں

بہت دن جا نہیں یوسف کا ابھی پہونچے زلیخا تک ‌ ‌ نکل کر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جہاں اکدم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں ‌ ‌ جس پہ بھولے تھے اب وہ بات نہیں

مجھ کو تم پر ہے اعتمادِ وفا ‌ ‌ تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ ‌ ‌ زندگی موت ہے حیات نہیں

یونہی گذرے تو سہل ہے لیکن ‌ ‌ فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دلسوز ہو تو کیجے بیاں ‌ ‌ سرسری دل کی واردات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید ‌ ‌ جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں ۔۔۔ چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال ۔۔۔ اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

بننے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار ۔۔۔ بات چھپتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا ۔۔۔ فتنۂ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب اصدق و صفایاں ہے انھیں کے دم سے ۔۔۔ مصلحت پر کبھی صحبتِ رنداں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد ۔۔۔ جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھہر جائے گا ۔۔۔ بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کس طرح اسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں ۔۔۔ خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کبھی آداب کی تکلیف نہ پوچھ ۔۔۔ ایسے الجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت سے نہ جائے ۔۔۔ اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ ۔۔۔ اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالیٔ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں ۔۔۔ شادیٔ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں

خوبروئی کے لئے زشتیٔ خو بھی ہے ضرور ۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سا طرحدار نہیں

قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار ۔۔۔ ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا — دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں
حق ہوا کس سے ادا اس کی وفاداری کا — جس کے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں
دیکھتے ہیں کہ بہو بختی ہے وہاں کون سی راہ — کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سنکر
جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

ہمیں تو ہیں خنجر کو مرنے سے اب انکار نہیں — اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں
کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
خشم بر دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ — غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں
ہو چکا ناز اٹھانے میں ہے گو کام تمام — للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں
ہم تو یوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا — دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں
اہلِ مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا — ورنہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

وحشت میں تھا خیال گل و یاسمن کہاں — لائی ہے بوئے انس نسیمِ چمن کہاں
ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی — جائیگا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
اہلِ طریق جس کو سمجھتے ہیں زادِ راہ — واں دخل دستِ برد کو اے راہزن کہاں
فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں — مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں
لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا — لیجائے ہم کو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر — وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ہو گیا ہے لذّتِ غربت سے آشنا — اب ہم کہاں ہو لیے نشاطِ وطن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے — شکوے کو لے گیا ہے وہ پیدا دہن کہاں
روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں

کہاں فکر میں اب وہ جولانیاں — وہ دریائے معنی کی طغیانیاں
کہاں وہ طبیعت کی رنگینیاں — وہ بزمِ سخن میں گل افشانیاں
کہاں اب وہ جلسوں میں احباب کے — سخن سنجیاں اور سخن رانیاں
دکھائی جو نہیں دورِ گردوں نے آنکھ — گئے بھول ساری غزل خوانیاں
جھکے بن زمانہ سے بنتی نہیں — رگڑنی ہیں یہاں سب کو پیشانیاں
لگے بڑھنے جیسے کہ ہوش و خرد ق — لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی ۲ — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں
اگر راست گوئی کی جرأت نہیں ق — تو جھوٹی ہیں واعظ کی لسّانیاں
منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی ۲ — بہت یاں ہیں درکار قربانیاں
گئے جھیل جب جاپ گر مشکلیں — یہی مشکلیں ہیں پھر آسانیاں
ہوا ناپدید جس ملک میں اتفاق — ہیں آبادیاں واں کی ویرانیاں
کھرے ہیں خرقہ پوش اب کوئی اور دو — یہ شکلیں تو ہیں جالی پہچانیاں
وہی لے گئے یہاں سے زادِ سفر — گئے جھاڑ جو اپنی ہمیانیاں

لگاؤ نہ اِس دارِ فانی سے دل ق[1] عیاں اُس کی ہیں سست پیمانیاں
جو یہاں آج ہے جوشِ عیش و نشاط توکل حسرتوں کی ہیں طغیانیاں

یہ آرام برسوں نہیں یہاں نصیب اگر چار دن ہیں تن آسانیاں
چمن ہے کہ ہے سیمیائی نمود" یہ کہتی ہیں نرگس کی حیرانیاں
گُل۔ آوازِ بلبل یہ ہیں سُن رہے کہ کتنے دن کی ہیں یہ خوش الحانیاں"
متاعِ وفا کا ہے دُنیا میں کال مگر گاہکوں کی ہیں ارزانیاں

لگا دیتے ہیں اس کی قیمت میں جو شہنشاہیاں اور سلطانیاں
کھلونوں پہ مرتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ یہ داناؤں کی یہاں ہیں نادانیاں
جھپٹتے ہیں مُردار کی پا کے بُو یہ ہیں شیر مردوں کی جولانیاں
بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ بنی نوع پر آتش افشانیاں
کلیجے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہیں یہاں سدا چیل کوؤں کی مہمانیاں
جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام جہانداریاں اور جہانبانیاں
ڈبوتی ہیں آخر کو منجدھار میں یہ فرعونیاں اور ہامانیاں

محبت کا دُنیا کے حالی مآل
پشیمانیاں ہیں پشیمانیاں

۱؎ یہ قطعہ روس اور جاپان کی لڑائی کے زمانہ میں لکھا تھا۔ ۱۲

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ‏ ‏ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح ‏ ‏ لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں ‏ ‏ دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

کہیں انجام آ پہونچا وفا کا ‏ ‏ گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا ‏ ‏ بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دل پر درد سے کچھ کام لوں گا ‏ ‏ اگر فرصت ملی مجھکو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے ملکر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مرے دل میں ہو گو مجھسے نہاں ہو ‏ ‏ مجھے بھی ڈھونڈھ لینا تم جہاں ہو

نہ چھیڑ دل ستا کر وصل عدو کا ‏ ‏ اگر سمع مبارک پر گراں ہو

تقاضائے محبت ہے۔ وگرنہ ‏ ‏ مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بیقدر ہوں محفل میں تیری ‏ ‏ کہیں ناخواندہ تو کبھی مہماں ہو

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں ‏ ‏ بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے ‏ ‏ جسے سننی ہماری داستاں ہو

مؤثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ	خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ
دل کو کس طرح سمجھیے کہ وہی ہے یہ دل	وہ امیدیں ہیں نہ ارمان وہ امنگیں ہیں نہ چاؤ
یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر	تو تو اچھا ہے مگر تیرے برے ہیں برتاؤ
دوست ہوں جسکے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست	سچ بتا تجھکو کسی سے کبھی ہے دنیا میں لگاؤ
تو وہی برقِ جہاں سوز ہے تن خواہ نہ تن	ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ
ایک ہی دوست اور اس سے ہمیں چھڑواتے ہو	ناصحو اب تمہیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ
ہو گیا ذکر قیامت تو اے حضرت واعظ	باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ
تجھکو اے ابر بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا	ایک ہی بار تم اے بادلو اس طرح نہ چھاؤ
پہونچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا	ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ امید	آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک	آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہونچے حرم کے لگ بھگ	وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ	فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد	بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا — نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ
یہ طبل تہی ہیں جو بجکارتے ہیں — جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے نہیں کچھ
دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا — ترے کام آیا نہ علم و ادب کچھ
ہے افسردہ مجلس کی صحبت سے واعظ — وہ گرمائیگا یہ بجھیں آگے جب کچھ
تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب — نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ
یہ ہے میرِ مجلس کہ جینی کی مورت — ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمۂ تر سب تا کا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی — نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے — نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا — مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا — مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ
پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت — بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن — جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا — جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے ستّر — خدا دے نہ تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم — پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں — یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر — نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

حقیقت محرم اسرار سے پوچھ — مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سن — مری الفت در و دیوار سے پوچھ
ہماری آہ بے تاثیر کا حال — کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ
دلوں میں ڈالنا ذوق اسیری — کمند گیسوئے خمدار سے پوچھ
دل مجبور سے سن لذت وصل — نشاط عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم حاصل عشق — ہماری چشم دریا بار سے پوچھ
نہیں آب بقا جز جلوۂ دوست — کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ
فریب وعدۂ دیدار کی قدر — شہید خنجر انکار سے پوچھ

فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل — یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے تھے باتیں جو ہم — وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

متاعِ بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ہے اُن کی دوستی پہ ہم کو تو بدگمانی — وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ اُن کی مہربانی
تاہم کوئی آخر کب تک سُنے ملامت — ناصح سے ہم کو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کے دل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے — دیتا نہیں وہ لذت پیاسے کو سرد پانی
اُمیدِ وصل سے سب کچھ جی چھوڑا ہے دیتا — جو کچھ سنا ہے ہم نے مشاطہ کی زبانی
ہر حکم پہ ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش — کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی
صبر و سکوں سے ہم کو یہ کبھی تڑپنے دے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہشِ نہانی
پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں — ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعفِ ناتوانی
دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے — کیا جانے کس ادا سے کی اُس نے دلستانی

اک نکتہ کے بیاں سے سر ہو نہ ہوگے حالی
چلتا نہیں کسی کا یاں لافِ نکتہ دانی

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے — گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام پلا دے
جو کچھ ہے سو ہے اُس کے تغافل کی شکایت — قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے
دل آرا سے اُمید دلاتی تو ہے لیکن — دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلاسے
ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہِ خوباں — یاں ہیں تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے

پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں — ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے
درگزرے دوا سے تو بھروسے پہ دعا کے — درگزرے ہیں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے
اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو — تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے
حالیؔ دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین — شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

جب وقت پڑے دیجئے دستک درِ دل پر
جھکئے فقرا سے نہ جھکئے امرا سے

بلبل و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار — مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے
دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر — چرخ کہتا تھا کہ بیت الحزن کس کا ہے
مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود — دوست کیا جانئے یہ چرخِ کہن کس کا ہے
واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا — ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے
آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق — عزمِ تسخیر پھر اے شیخِ زمن کس کا ہے
آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر — تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے
عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں تیری — رستہ اب دیکھئے دونوں میں کٹھن کس کا ہے
شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن پیرا کی — ولولہ تجھ میں یہ اے مرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے — ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز — کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
سیاہ و سپید باغ باغ ہیں۔ لیکن — بہیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے
کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب — کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے
قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا — طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے
بہت سے کھو دیے خلجان بینوائی نے — ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے
ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز — زمیں بھی اپنے خزانے اگلتی جاتی ہے
اڑے گی خاک تقدس کی اب سر بازار — فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بری اور بھلی سب گذر جائے گی — یہ کشتی یونہیں پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتا — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی
ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر — یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ! — یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں — یونہیں عمر ساری گذر جائے گی

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی — کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن — حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے — یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

رہی دانائی آخر غالب آ کر پہلوانی پر — گئے جیس مان سب جیتی و فرغانی و تیجاقی

ہمارے طرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ — لٹا دیتے تم یہ تم غیروں پہ کیوں مسک ہو کر باقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز — انہیں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک گھلی رکھتے ہیں اور ایک بندی — انہیں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے نہیں حق اندیشۂ رسوائی سے — گھات میں اُنکے لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہو دوست ہے تو بھی لیکن — بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اے غم دوست تجھی پر نہیں اپنی گذران — کچھ فتوح[1] اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

دل غنی رکھتے ہیں اے دولت دنیا جو لوگ — تیور ان کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

عقل ہے اپنی حماقت کے چھپانے کو انھیں — جنہیں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خود رائی بھی

عقل اور حسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ — ان کو خود رائی بھی پھبتی ہے خود آرائی بھی

ملنے دیگی نہ اجل تم سے ہمیں جی بھر کر — فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

---

[1] یعنی غم دنیا و غم زن و فرزند وغیرہ ۱۲

جی گئے ہم پہ رہے مُردوں[1] سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

رہا کُھل کے زاہد کا زہدِ ریائی — نبائی بہت بات پر بن نہ آئی
بُرائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن — کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی
گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب — عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی
ہنر کا یہ تھا جب بن گئے پارسا تم — نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی
بُرا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے — سوا اس کے مشرب میں ہے کیا بُرائی
جو کہیے تو جھوٹی جو سُنیے تو سچی — خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی
ہوئی آ کے پیری میں قدرِ جوانی — سمجھ ہم کو آئی پہ ناوقت آئی
وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت — وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی
جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح — جو واں دل پہ لی تھی تو یاں منہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

وصل کا اُس کے دلِ زار تمنائی ہے — نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
قطعِ امید نے دل کر دیے یکسو صد شکر — شکلِ قدرت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے
قوتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں — وقت جب آ کے پڑا ہے یہی کام آئی ہے
ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے — ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے

---

[1] اپنے دائم المرض ہونے کی طرف اشارہ ہے ۱۲

نشہ میں چور نہوں جھانجھ میں مخمور نہوں　　پند یہ پیر خرابات نے فرمائی ہے
نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی　　بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی۔ اور انگلیاں اٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے　　جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار　　آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے
دیکھ اے بلبل ذرا گلچیں کو آنکھیں کھولکر　　پھول میں یاں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے
عقل جھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی　　لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق　　آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجھ میں جو ہے اے شمع ہے کس برق عالم سوز کی　　جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی　　رہ گیا کیا ہے اب اے گبر و مسلماں باقی
بزم دعوت میں رسائی ہوئی اپنی آخر وقت　　میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی
حق ادا اک نگہ لطف کا ہوگا کیونکر　　دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی
ظاہرا روگ ہی الفت کا نہیں چارہ پذیر　　ورنہ چھوڑا نہیں ہم نے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجئے　　نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجئے
واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار　　اُس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجئے
ضبط کیجے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں　　اور کُھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجئے
دوست کے تیور ہیں ہم ہر رنگ میں پہچانتے　　بے تکلف ملئے ہم سے یا تکلف کیجئے
جبکہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول　　کھینچ لیجے ہاتھ اس پر بھی تصرف کیجئے
وقت تھا جو کام کا خالی گنوا بیٹھے اسے　　جائیے اب عمر بھر بیٹھے تأسف کیجئے

توبہ حضرت کی یہ نہیں اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دینگے ذرا دم بھر توقف کیجئے

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی　　جان کو ہم نے لگا لی ہے یہ علت کیسی
جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیمِ خزاں　　جن کی قسمت میں ہو کلفت انہیں راحت کیسی
جی کا اُلفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا　　وہ تو آفت تھی ہمارے لئے اُلفت کیسی
جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع ناداں　　قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی
عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ　　جنکو کچھ کام نہیں یاں انہیں فرصت کیسی
جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا　　وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی
جانتا ہے وہی۔ دل پر ہے گذرتی جسکے　　ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی
ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک　　ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی
جبکہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح　　وہ بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالِ انجام

یار کی ہیں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

سعی سے بہتر تن آسانی مری — کفر سے بدتر مسلمانی مری

تھا نہ محتاج سبب عفو کریم — کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری

خلد میں بھی گر رہی یاد اُسکی بھول — کم نہ ہو شاید پریشانی مری

بے لباسِ جسم تک مجھ پر گراں — دور جا پہنچی ہے عریانی مری

مانعِ گلگشت ہے بیمِ خزاں — موت کرتی ہے نگہبانی مری

قدرِ نعمت ہے بقدرِ انتظار — حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

خندہ زن ہے اُس مسلمانی پہ کفر
جیسی ہے حالیؔ مسلمانی مری

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سنا کیے اور مہرباں رہے

کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے — ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے

حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید — اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے

پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی — اُتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے — نرخِ متاعِ عشق ۔ الٰہی گراں رہے

حالیؔ بہت ملے ہیں گو ہم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اُن میں کہاں رہے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اُس کی کاٹتے رہے اور مہرباں رہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ۔۔۔ ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ ۔۔۔ یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے
وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس ۔۔۔ ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا روسیاہ ۔۔۔ تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام ۔۔۔ کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے ۔۔۔ آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو ۔۔۔ عذر اُن کی زباں پہ آنے لگے
ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں ۔۔۔ وہ اگر ہمت آزمانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے ۔۔۔ اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی ۔۔۔ غیر الفت بہت جتانے لگے
تم کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا ۔۔۔ ہم اگر دردِ دل سنانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ۔۔۔ ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں ۔۔۔ قافلے پھر حرم کو جانے لگے
سرِّ باطن کو فاش کر یا رب ۔۔۔ اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے — کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے

ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار — اُس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم — حالِ دل پھر اُس کو لکھا چاہیے

ہے دلِ افگاروں کی دلداری ضرور — گر نہیں اُلفت مدارا چاہیے

ہے کچھ اِک باقی خلش اُمید کی — یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے — بے نیازی اُس کی دیکھا چاہیے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز — کیجئے اغماض جتنا چاہیے

شیخ ۔ ہے اُن کی نگہ جادو بھری — صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیے

لگ گئی چپ حالیؔ رنجور کو
حال اُس کا کس سے پوچھا چاہیے

جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے — قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں — کہ اشک اشکِ دریا ہوا چاہتا ہے

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے — ملاپ اُن سے گویا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو — وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے

ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں — اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت — کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

فزوں تر ہے کچھ اِن دنوں ذوقِ عصیاں — درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

تعلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی — کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک　　دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
بہت حظ اُٹھاتا ہے دل تجھ سے ملکر　　قلق دیکھئے کیا ہوا چاہتا ہے
غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم　　سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے

بہت چین سے دن گذرتے ہیں حالی
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے　ق　آج دل لے گا اگر کل نہ لیا۔ یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں کہ سُنے اُس شوخ سے ہم　　یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے
ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر　　نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجئے　　اس بھلائی کا ہے انجام بُرا یاد رہے
شیخ یاں غمِ گُنہ شوق بھلا دیتا ہے　　تو یہ اُن کی ہے تمہیں اپنی خطا یاد رہے
وادیِ عشق میں موسیٰ کو ہو گر رخصتِ دید　　ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے
خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا　　بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا یاد رہے
دِل بُری طرح لگا عشقِ بُتاں میں اے شیخ　　دیں بچا پائیں اگر آپ کے خدا یاد رہے
چارہ گرا کار باندازۂ تدبیر نہیں　　کچھ ہمت اگر وقتِ دُعا یاد رہے

ابھی جاتا نہیں حالی نے کہا کیا تیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائینگے مزا یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے　　آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
افسوس شبِ وصال کے واں کارگر نہیں　　نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمائشِ تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحانِ پرسشِ شمشیر کر چکے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے

جاں لب تک انتظار میں آتی ہے بار بار
مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالی! اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات
مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی
جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے

بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار
تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہیں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کہوں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت
مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں[1] آکر سو جانے
یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے

---

[1] یہ غزل تقریباً ۱۲۸۷ھ میں اس وقت لکھی تھی جبکہ مجھے اوّل ہی اوّل تقریبِ ملازمت دلّی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا۔ اس وقت اوّل تو دلّی سے جدا ہونا ہی شاق گذرا تھا دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت

نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف ۔ مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام ۔ کہ بلبل نا آشنائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ ۔ نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور ۔ تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم ۔ خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول ۔ جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو ۔ جہاں غربت وطن پہ خندہ زن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی ۔ مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام ۔ یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے
گری نظروں سے سب باتیں پرانی ۔ مگر الفت کہ اک رسمِ کہن ہے
بھلا حالیؔ اور الفت سے ہو خالی! ۔ یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

دھوم تھی اپنی پارسائی کی ۔ کی بھی اور کس سے آشنائی کی

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۵۳ - وبائی - اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور شور رہا۔ آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا۔ اس تنہائی اور سراسیمگی و غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے تھے ۱۲... ۱۔ یہ غزل بھی لاہور میں اُسی وقت لکھی گئی تھی جب غزل سابق لکھی گئی تھی۔ آخر کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے - ۱۲ حالی -

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت	ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
منھ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے	تم کو عادت ہے خودنمائی کی
لاگ ہیں ہیں لگاؤ کی باتیں	صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن	ہم سے باتیں کرو صفائی کی
دل رہا پائے بند الفت دام	تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے	رکھئے امید دلربائی کی
شہر و دریا سے باغ و صحرا سے	بو نہیں آتی آشنائی کی
نہ ملا کوئی غارت ایماں	رہ گئی شرم پارسائی کی
بخت ہمداستانی شیدا[1]	تو نے آخر کو نارسائی کی
صحبت گاہ گاہی رشک[2]	تو نے بھی ہم سے بیوفائی کی
موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے	ساعت آپہونچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

کردیا خوگر جفا تو نے	خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے
دور پہونچی تھی اپنی آزادی	پر خدا جانے کیا کیا تو نے

---

[1] شیدا سے مراد منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اس زمانہ میں کبھی کبھی فکر شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے ۱۲۔ [2] رشک آنریبل نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد کا تخلص ہے ۱۲۔ حالی

کیوں نہ آئیں گے یاد وہ اے ہمدم — بس سُنا میں نے اور کہا تو نے
گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج — نہ کہا اور نہ کچھ سُنا تو نے
صبر کا ہے بہت بُرا انجام — ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے
ابتدائے وفا ہے سر دینا — میری دیکھی نہ انتہا تو نے
دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل — اور کھویا رہا سہا تو نے
ایک عالم کو خوش کیا اے رشک — ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سُنا تو نے

کر کے بیمار دی دوا تو نے — جان سے پہلے دل لیا تو نے
رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے
شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا — آ کے مسجد سے کیا لیا تو نے
[illegible] ہوائے دلِ مآل اندیش — کھو دیا عمر کا مزا تو نے
ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ — کیا کیا چشم آشنا تو نے
دل و دیں کھو کے آئے تھے سو دیر — یاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے اُمیدِ خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

دل کو درد آشنا کیا تو نے — درد دل کو دوا کیا تو نے
طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا — خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصلِ جاناں محال ٹھہرایا — قتلِ عاشق روا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں — غم کو راحت فزا کیا تو نے
جان تھی اک وبالِ فرقت میں — شوق کو جاں گزا کیا تو نے
تھی محبت میں ننگ منتِ غیر — جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

قطعہ
راہِ زاہد کو جب کہیں نہ ملی — درِ میخانہ وا کیا تو نے
قطع ہونے ہی جب لگا پیوند — غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ — عشق کو رہنما کیا تو نے
ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی — عقل کو ناخدا کیا تو نے
بڑھ گئی جب پدر کو مہرِ پسر[۱] — اس کو اس سے جدا کیا تو نے
جب ہوا ملک و مال رہزنِ ہوش — بادشہ کو گدا کیا تو نے
جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد — درد کو بے دوا کیا تو نے
جب دیا راہرو کو ذوقِ طلب — سعی کو نارسا کیا تو نے
پردۂ چشم تھے حجاب بہت — حسن کو خودنما کیا تو نے
عشق کو تابِ انتظار نہ تھی — غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے
حرم آباد اور دیر خراب — جو کیا سب بجا کیا تو نے

۱؎ اس شعر میں پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف علیہم السلام کی طرف اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ ۱۲ حالی۔

سخت افسردہ طبع تھے احباب — ہمکو جادو نوا کیا تو نے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب — کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

خالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

نفس کی فرماں روائی ہو چکی — خود پسندی خود نمائی ہو چکی
اب ہیں پیری کی عبودیت کے دن — بس جوانی کی خدائی ہو چکی
گرم جوشی۔ لطفِ صحبت ہو چکا — ناخوشی خفگی۔ لڑائی ہو چکی
موت کی راحت فزائی کا ہے وقت — زندگی کی جاں گزاری ہو چکی

قطرہ اب دریا میں جا ملنے کو ہے — تیری میعاد اے جدائی ہو چکی
جانتے ہیں جبریل کے شہپر جہاں — بے پروں کی واں رسائی ہو چکی
دیکھنا ہے تجھ کو اب اے جذبۂ عشق — عقل کی زور آزمائی ہو چکی
قید خانہ میں گیا دل جن کا لگ — اُن اسیروں کی رہائی ہو چکی
دَیر میں بھی لیجے قسمت آزما — مسجدوں میں جبہ سائی ہو چکی
خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو — باپ دادا کی بڑائی ہو چکی
وقت ہے اے زاہدا اب تشہیر کا — شہرتِ زہدِ ریائی ہو چکی
ہے چڑھائی علم کی مذہب پہ اب — شرک و بدعت کی چڑھائی ہو چکی
فلسفے سے اس کی اب مٹ بھیڑ ہے — سفسطے سے ہاتھا پائی ہو چکی
رہ گئی ہے مذہب و سنت کی جنگ — ملک و دولت کی لڑائی ہو چکی

ہو نہ مذہب کی صفائی جب تلک
اہل مذہب کی صفائی ہو چکی

اب نہیں چھٹنے کا اسے حالی دماغ
بس بہت بدیاں سرائی ہو چکی

مستیٔ جہل میں غفلت کا نشا اور سہی
شبِ تاریک میں گھنگھور گھٹا اور سہی

دوستو روگ بظاہر نہیں جانے والا
ہو چکیں ختم دوائیں تو دعا اور سہی

کم نہ تھے روگ جوانی میں بھی کچھ اے پیری
رعشہ اب اور سہی لغزشِ پا اور سہی

گر گنہ عفو کی امید پہ کرنا ہے خطا
ہیں جہاں لاکھ گنہ ایک خطا اور سہی

شہ کو ہے خوف عدو خوف اجل خوف زوال
کہدو اے بیخبر اک خوف خدا اور سہی

بیوفا کونسی خوبی ہے نہیں جو تجھ میں
وصف اتنے ہیں جہاں ایک وفا اور سہی

ترک دنیا کے علائق تو کئے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترکِ ریا اور سہی

تیرے انفاس نے مُردوں کو کیا ہے زندہ
ایک جھونکا ادھر اے بادِ صبا اور سہی

مدرسہ میں نہ ملا کچھ۔ تو نہ توڑ آس اے دل
ایک درِ دولتِ ساقی پہ صدا اور سہی

تم تو حالی یہی طرز اپنی نباہے جاؤ
طرزِ شعر فصحا و بلغا اور سہی

نہ عیش[1] کیخسروی رہے گا نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہیگی
رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گئے تارے تم آسماں کے
کسی کی آگے بنی رہی ہے نہ اب تمہاری بنی رہیگی

---

[1] یہ غزل سنہ ۱۹۰۰ء کی تصنیف ہے ۱۲

گرایا تو پرانیوں کو تو نے یہ پچھاڑا ماٹر ندرانیوں کو
کہاں تلک اے شرابِ غفلت یہ تیری مردافگنی رہیگی

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن[1]
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی۔ دل اُتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

کرے گی کچھ عقل رہنمائی۔ نہ علم سے ہوگی کچھ صفائی
گناہ کی گندگی میں دنیا یونہیں ہمیشہ پھنسی رہے گی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہیں ٹھنی کی ٹھنی رہیگی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
رہوگے گر حسن ظن کے طالب تو تم سے یہاں بدظنی رہیگی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت اُن کی غنی رہے گی

کہنے کی بات ہو اُسے کہہ سنائیے
جو دل پہ بن رہی ہے وہ کیونکر دکھائیے

دنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے
یاں کھوئیے بہت سا تو کچھ جا کے پائیے

یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبہ میں مقام
ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگائیے

---

[1] یونیورسٹی بل کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ حالی

گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو — ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار جائیے

اور اشتیاق دیکھتے ہو اشتیاق سا — بس آ گیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے

پھر پائے بس زبان سے جو ناگفتنی تھی حق — فارغ خطی ہم اپنی ابھی لکھ دیں لائیے

مشکل ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک — زمزم میں غسل کیجے کہ گنگا نہائیے

پھرتا ہو جو کہ کودتا غیروں کی آگ میں — چھیڑیں اہل گرفتہ کی کب تک ستائیے

ہوتی ہے جو ہم غم میں ہے کیوں زہر کی تلاش
حالی بتائیں آپ کو ۔ گر کچھ کھلائیے

وصفِ چمن قفس میں بہت سے تو خوب ہے — پوچھو وطن کی قدر مسافر غریب سے

نالوں سے ایک دم نہ ہوا تاشی کو قرار — کیا کہہ گئی چمن میں صبا عندلیب سے

آگ اور لگا گئے ساقی کہے شراب کے — نفرت رقیب سے نہ ارادت حبیب سے

اب دل سے دور رکھیو خیالِ نشاطِ عمر — آواز دے رہا ہے یہ کوئی قریب سے

شادی ہے ایک کی وہی جو دوسرے کا غم — دنیا کے بھی ہیں شادی و غم کچھ عجیب سے

دوں پڑھنے نہ درد دل کو مروں اس کے جیوں — یا ٹالے سے کوں صلاح۔ نہ پوچھوں طبیب سے

کہتا ہوں۔ دیکھتا ہوں جسے خوار دیے وقار — "ہے کوئی خاندان شریف و نجیب سے"

طالب میں صدق ہے نہ عقیدت مرید میں — ہیں آجکل کے پیر بھی کچھ بد نصیب سے

پڑھے وہ خطبہ جس میں کہ صدق و صفا نہ ہو — کہہ دو یہ جا کے برسرِ منبر خطیب سے

فاقے میں تم کو دیکھ کے جاتی ہے بھوک بھاگ — پہنچا ہے نسخہ آپ کو یہ کس طبیب سے

اب جس کے جی میں آئے بھرے شاعری کا دم — میدان آجکل ہے یہ خالی نقیب سے

نعم البدل ہے داغؔ کا حالیؔ "کلام داغ"
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

تیر پیہم لگائے جاتا ہے — نشتروں نظروں کھائے جاتا ہے

دیکھئے اور کیا دکھائے فلک — ابھی آنکھیں دکھائے جاتا ہے

دوستوں کو رُلا چکا - لیکن — دشمنوں کو ہنسائے جاتا ہے

ہو چکی قومِ مُردہ - پر جلّاد — ابھی دُرّے لگائے جاتا ہے

گو کہ حالیؔ میں دم نہیں باقی — ڈور اپنی ہلائے جاتا ہے

گو نہیں آس خیر کی - لیکن — خیر سب کی منائے جاتا ہے

اب سُنے اس میں کوئی یا نہ سُنے
وہی راگ اپنا گائے جاتا ہے

رباعیات

رباعیات

توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ایضاً

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھکو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
خورشید کا شمس جب میں پھیلا جب نور

ایضاً

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال
لیکن انھیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

توحید

مٹی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں — کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک — گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

ایضاً

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لئے — طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لئے

ایضاً

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد — دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے — رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

نعت

زہاد کو تو نے محو تمجید کیا — عشاق کو مست لذت دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی — توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

ایضاً

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا — اور امتوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار — بچھڑے ہوئے گلہ کو بہم تو نے کیا

ایضاً

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف — یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر — آباد کو بھی ہے تیری آبوت سے شرف

صلحِ کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں	شر نے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنّم دنیا	وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی	بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہمکو چھوڑا	ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

جوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح	ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل انکے ہیں ظرفا انکے جو کرتے ہیں تیز	ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکوں میں مشہور بہت	ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص	نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جان ہے دین پہ قربان	پر آیا جب امتحان کی زد پر ایمان
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح	فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہان

عشق

ہے عشق طبیبِ دل کے بیماروں کا	یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ اتنی ہے خبر	اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بیداے فرزند — ایک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں — ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بیجا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ اوہام رہے — جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے — صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں — گردن پہ نہ لو عقلِ خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے ابہم — کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور — پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو — گھٹنے سے کہیں اُن کے نہ بڑھ جائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم — ہوتے نہیں ساتھ جب دم[1] اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار — بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرط قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں — پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے مگر — عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی [illegible] کہیں

---

[1] دم دعویٰ اور قدم عمل ۱۲

طالب کو سوچ سمجھکر پیر بنانا چاہیئے

ہوں یا نہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں — پر ڈر ہے کہ طالب نہوں نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی — اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر — آتا نہیں فرق اسکے سوا انمیں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا — جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجام ترقی بشر — یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنسکر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب — ہوجائینگے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

مسرف کو کیونکر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعم مسرف نے یہ عابد سے کہا — کر میرے لیے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ — محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے — آتا ہے اگر آج ۔ تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی نپٹاؤ — طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہے نفس میں انسان کے جبلّی یہ مرض — ہر سعی پہ ہوتا ہے طلبگارِ عوض
جو خاص خدا کے لئے تھے کام کیے — دیکھا تو نہاں انمیں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں — گڑ گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اِن کی ہے نوبت تو کل اُن کی باری — بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضائے سِن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا — پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی اُمید — وہ وقت گئے۔ اب اور موسم آیا

جسکو زندگانی کا بھروسہ نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دُنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان — اولاد کو شستی پہ قناعت کا گمان
بچّے آوارہ اور بیکار جوان — ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان — برسات میں سبزہ کا نہ تھا جسپہ نشان
مایوس تھے جسکے جوتنے سے دہقان — یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لایق ہوتا — شیریں سخنی سے شہد فایق ہونا
ممکن نہیں جب تک کہ نہو دلمیں نفاق — آسان نہیں مقبولِ خلائق ہونا

مسلمانوں کی بےمہری

جب تک کہ نہو دشمن اخواں پکّا　　ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے　　سُنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکّا

مکر و ریا

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا　　خطرہ نہ اُنھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر　　بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں　　پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ　　ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال　　غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح　　جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے　　سرچشمۂ نعمائی و آبادی تو ہے
آسایشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے　　دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

ایضاً

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں　　مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح　　رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے — عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھاٹ کا نسب بھی عالی — پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا مجھ سے ہے عزت ہے یہاں — فرمایا ہنر نے میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں — میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

توقع بیجا

ہیں یار رفیق پر مصیبت میں نہیں — ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انسان سے توقع ہے عبث — جو نوع البشر کی خود جبلت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جسقدر کمی اور بیشی — اتنی ہی مغائرت ہے یہاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکر مآل — ضدین ہیں دوستی و دور اندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے — ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں — کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

ایضاً

اے عیش و طرب تو نے یہاں راج کیا — سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل — بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں

اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

عشق

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ

دیکھا سدا سلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل خاندانوں کو تباہ

سبب زوال سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم

یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دنیا کو دیئے دین نے اسرار و حکم
دنیا نے کر دین کی تھامی جس دم

گر دین کی ممنون بہت ہے دنیا
دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگان راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ
کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ

جھوٹے[1] کو نہیں ملتی شہادت جس وقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

---

[1] یعنی کفر و ضلالت ایسی چیزیں ہیں جنکا علم خدا کے سوا اور کسیکو نہیں ہوسکتا مثلاً شیخ اکبر کو بعضوں نے صدیق کہا ہے اور بعضوں نے زندیق اور یہ بات کہ وہ فی الواقع صدیق تھے یا زندیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پس جس شخص میں کوئی صریحی اخلاقی برائی یا عیب موجود نہو اسکی تکفیر یا تضلیل کرنی ایسی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مدعی کو شہادت نہ ملے اور وہ اپنے دعوے پر خدا کو گواہ قرار دے ۱۲ حالی

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب یہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار — اُس قوم کا جیتنا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا — ذلت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

عفو باوجود قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا — مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے — جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی سے

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجیے تسکین — زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے — اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمت

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار — دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لیکے پہونچا تو کہا — مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار

کم ہمتی

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار — دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور — جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا — ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے ندامتوں کی جانا ہم نے — دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسف بر وفات نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم نیر تخلص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز — آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار — سو اُسکی بھی کل سے نہیں آتی آواز

ایضاً

غالبؔ[1] ہے نہ شیفتہ نہ نیرؔ باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انورؔ باقی
حالیؔ اب اسی کو بزم یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں — محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موئے کو ملی نہ قوم کی چوپانی — جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

گدائی کی ترغیب

اک مرد توانا کو جو سائل پایا — کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ "ہے اس کا اُنکی گردن پہ وبال — دے دیکے جنہوں نے مانگنا سکھلایا"

تکفیر اہل اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں — سُنتے سُنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

ترک عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو — کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو

---

[1] یہ اُن شعرائے دہلی کے نام ہیں جنکے ساتھ راقم کو ربط و اختصاص رہا ہے عام اس سے کہ وہ مشہور و نامور ہوں یا نہ ہوں ۱۲ حالی

افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں — چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اوّل کوشش اور بعدہٗ دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے — پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب[1] تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا — پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے — بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح — مُردوں کی طرح جیئے تو کیا خاک جیے

جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے پیچ میں سب کھونے والے — بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جنکی جیبوں میں مدام — اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار — بدظن نہ ہو عیب اسمیں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر — کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

سکوتِ درویش جاہل

مصروف جو ہوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ — خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ

[1] جب تک کہ جب تک کہ کشتی نہ بنائی ۱۲ حالی

بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت   معلوم ہے ہمکو جتنے پانی میں ہیں آپ

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکرِ قرآن و خبر   کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑکر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ   کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا   ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر   اُس سے بھی گیا کہ جسکے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق ہو سماعت نہو جب کانوں میں   دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح   دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی   کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ   دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سن کر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور   داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سن کر ناخوش   مقصود یہ ہے کہ ہو ستائش کچھ اور

حسن ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں   نیکی میں شک اسکی کوئی لایا ہی نہیں

ہو سکے رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ پر اسکو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی بُرائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوامِ تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنے بیمار اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکرِ عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھ لو زادِ سفر موّاج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ بیچلو مال کھرا ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگذر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انسان ممکن ہے۔ بدی کا نہ رہے اس میں نشان
ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے انسان ہے ابتک وہی قرانِ الشیطان

سلاطین کا عشق

ہر چند برا ہے عشق کا سب سے مآل پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سلطاں ہے اگر ظلِّ الٰہی۔ تو عشق ہے ظلِّ الٰہی کے لئے وقتِ زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ بن تجھ سے۔ بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لئے تیار رہنا چاہیئے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر

کیفیت شب اُٹھا چکے اب حالی مجلس کرو برخاست ہوا وقت سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک ہے جوہر انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابل عفو ہے

غصہ پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں جبتک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سفہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر بنصیب اعدام رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرض پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجہ سے نکلنا معلوم پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

اسراف

مسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں نعمت نہ خدا کی رائگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں بہتر ہے اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

ردِ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے نہ صواب زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب

بدتر ہے ہزار بار اے دون ہمت — سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں — جو دیکھ کے پکھ کے دلسے کھائے ہیں کہیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک — جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جائداد مال و دولت کا خیال — مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی — اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوف زوال

اچھوں کو برا سننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا — جو کرکے بھلا۔ خلق سے سنتے ہیں برا
ان گالیوں کا ہے جنکو چسکا حالی — آتا نہیں ان کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریہ[۱] طرح کلام راقم

جوش خم بادہ جام خیال میں ہوا — پھر ولولہ پیدا دل حالی میں ہوا
تسلیم نے دی کچھ اسطرح داد سخن — مجھکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

احسان بے منت

احسان کے ساتھ گر صلہ کی خواہش نکلو — تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احسان نہ کرو

---

[۱] مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو فارسی کے راقم کے کلام کی ستائش میں اُس وقت بھیجے تھے جبکہ مدت سے فکر شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُن قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی ۱۲۔

کرتے ہو اگر احساں تو کرو اُسے عام   اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

قانون بد اخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار   حاشا کے ہو اُن پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُنکو نہیں حاجت اُنکی   اور بد نہیں بنتے نیک اُن سے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اَڑنا نہ کہیں   بھڑکیگی مدافعت سے اور آتش کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف   جز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل   اِک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی اجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اُٹھکر حضور   ہے ٹیکس کا وقت بھی اِسی طرح اٹل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں   اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے   بس مجکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں   دل دیتے ہیں پیری سے گذرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اِک قید سے آزاد سدا   جو جیتے ہیں اِس طرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام   واعظ نے درستی سے کیا اُس سے کلام

بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے — ایسی ملّت اور ایسے مذہب کو سلام

نواب وقارالامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق[۱] نے اُس کی چھوڑ دی ہمراہی — اقبال پہ جس نے فتحیابی پائی
حالی سے جائے کون بازی اُن سے — ہے جن کی رگوں میں خون آصفجاہی

عادت پڑی ہوئی مشکل سے جاتی ہے

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت — مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا — عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

عاشق کا نوحہ

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے — جب یاد کرینگے مجھے تب روئیں گے
اُلفت پہ، وفا پہ، جاں نثاری پہ مری — آگے نہیں روتے تھے تو اب روئیں گے

فرقت کی رات

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گذرے — اک خستہ جگر کی رات کیونکر گذرے
گذری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی — یہ چار پہر کی رات کیونکر گذرے

---

[۱] یہ رباعی ۱۳۰۶ھ میں جبکہ راقم حیدرآباد میں مقیم تھا اور نواب وقارالامرا ابھی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے۔ لکھی تھی مگر اُن کی خدمت میں بھیجی نہیں گئی۔ خونِ آصف جاہی میں اس بات کا اشارہ ہے کہ حضور سے قرابتِ قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں اُن کے خطاب کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ (حالیؔ)

معشوق کی یاد

یاد اُسکی یہاں وِرد مدام اپنا ہے ۔۔۔ خالی نہ ہو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجئے کہ ہے نام اُس کا ۔۔۔ کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

قولِ حق کا پاس

کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ ۔۔۔ تنہا تھے یہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
"میں اور اطاعتِ یزید گمراہ!!! ۔۔۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ"

حُر کی آرزو

حُر کہتا تھا اے دلِ شہ ذیجاہ سے مِل ۔۔۔ گرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مِل
سرگشتگیِ کوئے ضلالت کب تک؟ ۔۔۔ اللہ سے ملتا ہے تو چل شاہ سے مِل

۱ یزید

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا ۔۔۔ اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ کچھ ا بحرِ غفلت کی یزید ۔۔۔ واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

۱ توحید

ہستی تری گو نہیں ہے محتاجِ دلیل ۔۔۔ صبرِ دلِ مضطر کی مگر کیا ہے سبیل!
یہ طبعِ حسیں مطمئن ہو کیونکر ۔۔۔ بے دیکھے ہوا نہ مطمئن جبکہ خلیل ۲

---

۱ یہ رباعی اور اُس کے آگے چوبیس ۲۴ رباعیاں "علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" مطبوعہ ۲ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء سے نقل کی گئی ہیں ۱۲۔ ۲ چوتھے مصرع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام

ایضاً

اے عقل کی ۔ فہم کی رسائی سے دُور　　ادراک سے اوجھل ۔ تو نظر سے مستور
یہ حسرتِ دید دل میں قائم رکھیو　　بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نور

ایضاً

سُقراط منادی میں تری کام آیا　　سر تیرے لئے حسینؑ نے کٹوایا
مرکر کوئی پائے ۔ یا کہ سر کٹوا کر　　پایا تجھے جس نے اُس نے سب کچھ پایا

ایضاً

دریا سے اُٹھا کے بھاپ مینہ برسایا　　پیراہنِ سبز خاک کو پہنایا
دانے کو کیا نخلِ تناور تونے　　پانی جڑ سے پھننگ تک دوڑایا

خدا کی بے نیازی

منوائی ہے ہار سب سے بازی نے تری　　طبقے اُلٹے ہیں ترکتازی نے تری
ہے کالو ری اور کربلا اس پہ گواہ　　جو گھر گھالے ہیں بے نیازی نے تری

طالبِ صادق آخر کامیاب ہوتا ہے

طالب کا رہے گا پڑ کے پاسا آخر　　دے گا اُسے صدق دل دلاسا آخر
جھوٹی نہیں گر پیاس تو آگے پیچھے　　دریا پہ پہنچ رہے گا پیاسا آخر

(بقایا نوٹ صفحہ ۲۸۵) ؑ کے اُس جواب کی طرف اشارہ ہے ۔ جو اُنھوں نے جنابِ الٰہی میں عرض کیا تھا ۔ بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی

تشنگیٔ طلب

کب تک کوئی سوزشِ نہانی کو چھپائے کب تک اپنے کو تشنہ سیراب دکھائے
مجبار ورم ریزے تری اے ساقی پتھر کا کلیجا ہو تو پانی ہو جائے

پیری

علم و عمل و کتاب سے نفرت ہے لکھنے پڑھنے کے نام سے وحشت ہے
تو نے ہر دردِ سر سے دی آکے نجات پیری رحمت ہے! تجھ کو صد رحمت ہے

ایضاً

پیری نہیں منزلِ فنا ہے گویا اب کوچ کا وقت آلگا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

انسان کی عظمت بقدر قلّتِ حاجت ہے

دولت کی ہوس اصل گدائی ہے یہ سامان کی حرص بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے۔ تو ہے یہ شہنشاہی اور کچھ نہیں حاجت۔ تو خدائی ہے یہ

افراطِ دولت کی مذمت

محنت سے وصول ایک پیسا ہے اگر گر اشرفیوں کی تھیلی پر نہ نظر
یہ کینچلی میں بھرا ہوا سانپ ہے سانپ! ہاں! سوچ سمجھ کے ڈالنا ہاتھ اس پر

دولت کی تعریف

دولت خرمن بھی۔ برقِ خرمن بھی ہے تلوار کی دھار بھی ہے جوشن بھی ہے
تھوڑا سا ہے ابلیس کا شر تو ہے خیر بہت گر سانپ ہے یہ تو سانپ کا من بھی ہے

حالتِ موجودہ پر قانع نہ ہونا

حاصل ہے اگر خوشی تو ہے غم کی تلاش　　گر شہد میسر ہے تو ہے سم کی تلاش
قانع نہیں کوئی حالتِ نقد پہ یہاں　　جنت میں بھی شاید ہو جہنم کی تلاش

خوشی کی اُمید نہ رکھنا ہی بڑی خوشی ہے

اولاد کا ہے ایک کے دل میں ارماں　　اور دُوسرے پر ہے بارِ اولاد گراں
گر چاہے عالمِ تعلق میں خوشی　　رکھے نہ یہاں خوشی کی اُمید انساں

سب صحبتیں برہم ہونے والی ہیں

نقشے[1] میں خوشی کے سب بگڑنے والے　　پودے نہیں اُس کے جڑ پکڑنے والے
مِل بیٹھا ہے یہ ناؤ ندی سنجوگ　　ہیں اب کوئی دم میں سب بچھڑنے والے

جیسی رعیّت ہوگی ویسی ہی اُس پر حکومت کی جائیگی

حاکم سے بھلائی کی توقع ہے محال　　جب تک کہ رعیّت کے بدلے ہوں نہ خصال
تم اپنے سوا کسی کے محکوم نہیں　　عمّال ہیں بس یہی تمہارے اعمال[2]

دُنیا کی موجودہ حالت

ہیں برف سے پیچ سے ہلاک پامال کہیں　　طاعون سے نازل کہیں بھونچال کہیں
ابتر ہے کچھ ان دنوں نظامِ عالم　　عمّال نہ ہوں خلق کے اعمال کہیں

---

[1] اس رباعی میں ایک خاص صحبت کا ذکر ہے جس میں سب اصحاب تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے سے بچھڑنے والے تھے۔۱۲ [2] اس رباعی میں حدیث ذیل کی طرف اشارہ ہے یعنی عمّالکم اعمالکم ۱۲

افسونِ محبت

ہے جن کو کہ صیدِ دلِ انساں کا خیال — لازم ہے کہ پھیلائیں محبت کا جال
اُستاد کو یاد ہو اگر حُب کا عمل — تعطیل میں بھی نہ چھوڑیں کتبِ اطفال

زخارفِ دنیوی کی بے ثباتی

گلشن میں نہیں ہے تری اے گُل جوڑی — تو نے نہیں آنِ حُسن کوئی چھوڑی
تھا جی میں کہ تجھ سے باندھیے عہدِ وصال — پر کیجیے کیا؟ عمر ہے تیری تھوڑی

غیروں کو اپنا بنانا

گر چاہو کہ جیتے جی بھلے کہلاؤ — اپنوں کو سلوکِ نیک سے پرچاؤ
پر مدِّ نظر ہو گر حیاتِ ابدی — بیگانوں کو آشنا بناؤ۔ جاؤ

کام کا وقت

یارو! نہیں وقت عیش و آرام کا یہ — موقع ہے اخیر فکرِ انجام کا یہ
بس حُبِّ وطن کا جب چکے نام بہت — اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

ذلت کی زندگی

نکبت میں ہے رنج و غم خوشی سے اولیٰ — رونا یاروں کا ہے ہنسی سے اولیٰ
ہیں دیس میں بے وقار پردیس میں خوار — مرنا ہے بس ایسی زندگی سے اولیٰ

قدرِ نعمت بعدِ زوال

دو چار اگر ہیں کام کرنے والے — ہیں اُن کو ہزاروں نام دھرنے والے
تب قوم کی شاید کہ کھلیں گی آنکھیں — مر جائیں گے جب قوم پہ مرنے والے

قومی خدمت کا صلہ

کہدو جنھیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ — طعنے جھیلو، تیر سہو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سر دست — گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے! تو آؤ

مصلحت کی بات ماننی لازم ہے

گر پیر مغاں کہے "مریز و نگہدار" — ہے مصلحت اسی میں کچھ نہ کہہ اسے میخوار
ہوتا نہ مساکین کا گر خیر اندیش[1] — خضر ان کا نہ توڑتا سفینہ زنہار

انصاف کی پکار[2]

پاؤگے نہ کوئی حرف سے تا قاف — حق تلفیوں سے دلیں نہ ہوں جس کے شگاف
گر غور سے سنیے غل ہے یہی چار طرف — انصاف! انصاف! ارے انصاف! انصاف

اپنے دست و بازو سے کام کرنے کی ترغیب

اترو دریا سے اپنے بل تیر کے پار — کب تک تیروگے ہو کے تونبوں پہ سوار
تم ڈوبنے کے یہ کر رہے ہو ساماں — اوروں کا سہارا تکنے والو ہشیار

پیری میں نفس کا اغوا کرنا

پیری میں نہ عقل چھوڑتی کینے دیتی — کرتا رہتا نہ دل کو گر نفس قوی
یاد آتی ہے جب موت تو سمجھاتا ہے — "یا با کہ آمدی و کہ پیر شدی"[3]

---

[1] حضرت خضر کے قصہ کی طرف اشارہ ہے دیکھو آیات قرآنی وما السفینۃ فکانت لمساکین ۱۲
[2] یہ رباعی اور اس کے آگے ۹ اور رباعیاں علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۹ء سے نقل کی گئی ہیں۔ ۱۲
[3] جس کو تعبیر ہم کہتے ہیں

قوموں کی زندگی اور موت میں فرق

اقوام میں زندگی کی ہے روح جہاں   چونک اُٹھتے ہیں ایک ہاں پہ وہاں سو جواں
کرتی نہیں وحی "مردہ قومیں" وہ کام   جو کام اِک "کارٹون" کرتا ہے وہاں

نفس کی خواہشیں دولت کی دشمن ہیں

یا نفس کی خواہشوں کو روک اے زردار   یا فاقہ و فقر کے لئے رہ تیار
لاگے ہوئے ہیں چار طرف گھات میں چور   گھر سے ہشیار! مال و زر سے ہشیار رہ

یہاں صرف دو چیزیں اپنی ہیں

گھر بار اپنا ہے اور نہ دولت اپنی   کنبہ اپنا۔ نہ ہے قرابت اپنی
اپنی نہیں کوئی چیز یہاں دو کے سوا   ایک موت اپنی ہے۔ ایک تربت اپنی

عاشق و معشوق دونوں پر حُسن کا تسلّط ہے

ہے حُسن ہی کا کرشمہ چشم بددُور   عشاق کی بیخودی حسینوں کا غرور
یہ وہ مے تند ہے نشے میں جس کے   عاشق بھی ہے چُور اور معشوق بھی چُور

نوٹ صفحہ ۲۰۰ سطر ۹ "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے" اسی طرح ایرانی اس موقع پر یوں بولتے ہیں "کہ آمدی و کے پیر شدی" اس رباعی میں بطور کنایہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نفس عقل کی بات نہیں چلنے دیتا اور ہمیشہ غفلت چاہتا ہے - ۱۲

تشنگیٔ طلب

ساقی ہاے سب کے کام آنے والے تم اپنے پرائے پر لنڈھانے والے
چھینٹا اک اِدھر بھی بادۂ گلگوں کا او تشنہ لبوں کی دَوں بجھانے والے

علم کی ترقی سے یقینیات بھی مشکوک ہو جاتے ہیں

بڑھتا جاتا ہے جس قدر علم بشر کرتے جاتے ہیں شک خیالات مگر
ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی ہی فضا جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر

دنیا سراسر شر ہے

دنیا ہے وہ شر جس میں نہیں نام کو خیر رشتہ ہے بدی سے اس کا نیکی سے بیر
اور سب سے بڑا یہ عیب ہے اس میں آہ ترقی نہیں یہاں کسی طرح اس کے بغیر

میر انیس لکھنوی

(غیر مطبوعہ)

اردو اگو راج چار سو تیرا ہے شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

ایضاً

(غیر مطبوعہ)

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیس اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلّی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

ہنگامہ مسجد کانپور

(منقول از روزنامہ "ہمدرد" جلد ا نمبر ۶۰ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

یارانِ وطن نے قوم کا ساتھ دیا　　دی قوم نے دادِ قوم بے رو و ریا
ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی　　ہنگامۂ کانپور نے کام کیا

ایضاً

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا　　گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے　　جو کارِ نمایاں کہ مصیبت نے کیا

ایضاً

تائید میں حق کے جو بلا آتی ہے　　ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے　　روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

روزانہ ہمدرد کا اجرا

(از ہمدرد ۱۴ جون ۱۹۱۳ عیسوی)

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب　　اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یارب
"ہمدرد" کو اسم بامسمّیٰ کیجو　　اس نام کی لاج تیرے ہی ہاتھ ہے اب